

اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے قبل چند گزارشات

علامہ محمود شاکر ابو فہر کا ڈاکٹر طہٰ حسین کی کتاب ''الفتنۃ الکبریٰ'' (فتنۂ اکبر) پر لکھا گیا رد (جو ان کے مقالات کے مجموعے جمھرۃ مقالات محمود شاکر میں شامل ہے) تاریخِ اسلام کے ایک انتہائی حساس دور کی تفہیم کے لیے ایک بنیادی علمی دستاویز ہے۔ طہٰ حسین نے اپنی کتاب کو دو حصوں (عثمان اور علی و بنوہ) میں تقسیم کر کے الفتنۃ الکبریٰ (سیدنا عثمان غنی کی شہادت اور بعد کے حالات) کا تجزیہ کیا تھا۔

قاری کے لیے اس علمی بحث اور علامہ محمود شاکر کے رد کا اصل موضوع سمجھنے کے لیے ذیل میں ایک مختصر اور جامع مضمون پیش ہے:

1۔بحث کا بنیادی نقطہ (مرکزی تنازع)

ڈاکٹر طہ حسین اور علامہ محمود شاکر کے درمیان اصل اختلاف تاریخی واقعات پر نہیں، بلکہ واقعات کی لائقِ تسلیم تشریح، اسباب اور تجزیاتی منہج (Methedology) پر تھا۔

☚ ڈاکٹر طہ حسین کا موَقف:

طہ حسین نے مستشرقین (Orientalists) اور جدید مغربی مادی نقطۂ نظر سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ فتنہ محض ایک "عربی فتنہ"(فتنة عربية) تھا، جو عربوں کے آپس کے سیاسی، معاشی، طبقاتی تضادات، مال و دولت کی غیر مساوی تقسیم اور جاہلی عصبیتوں کے دوبارہ بیدار ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ انہوں نے بیرونی سازشوں (جیسے عبداللہ بن سبا کے کردار) کو اہمیت دینے سے انکار کیا۔

☜ علامہ محمود شاکر کا رد:

علامہ شاکر نے اس مادی اور سیکولر نظریے کو یکسر مسترد کیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اسلام نے صحابہ کرام کی جس طرح اخلاقی تربیت کی تھی، اس کے بعد

ان کے درمیان محض مال و دولت کی ہوس یا جاہلی عصبیت کی بنیاد پر ایسا ہولناک فتنہ برپا ہونا ناممکن تھا۔ اس فتنے کے پیچھے باقاعدہ ایک منظم بیرونی نظریاتی سازش (ابن سبا اور اس کے مفسد گروہ) کارفرما تھی، جس نے نو مسلم اور سادہ لوح عناصر کو ریاست کے خلاف بھڑکایا۔

2۔ علامہ محمود شاکر کے رد کے اہم نکات

علامہ محمود شاکر نے اپنے مضامین میں طہ حسین کی کتاب کے جن علمی تضادات کو بے نقاب کیا، وہ درج ذیل ہیں:

☆ طہ حسین کی تکرار اور ملمع کاری: علامہ شاکر نے گرفت کی کہ طہ حسین اپنی کتاب میں بار بار ''عربی فتنہ'' اور ''عرب عوام'' جیسے الفاظ کی تکرار کر رہے ہیں۔ اس تکرار کا اصل مقصد تاریخ کو مسخ کرنا اور اس جرم سے غیر عرب سازشیوں (یہودی و مجوسی عناصر) کا نام مٹانا ہے۔

☆ صحابہ کے کردار کا دفاع: طہ حسین نے جلیل القدر صحابہ کو معاشی اور سیاسی مفادات کے لیے آپس میں لڑنے والے گروہوں کے طور پر پیش کیا۔ علامہ شاکر نے قرآنی نصوص اور مستند تاریخی حقائق سے ثابت کیا کہ صحابہ کرام کا باہمی اختلاف دنیاوی لالچ پر نہیں بلکہ مخلصانہ ''اجتہاد'' اور امت کی اصلاح کی نیت پر مبنی تھا۔

☆ مغربی منہجِ تاریخ پر تنقید: علامہ شاکر کا کہنا تھا کہ اسلامی تاریخ کو کارل مارکس کے مادی فلسفے (Materialistic History) یا مغربی سیاسی نظریات کے چشمے سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ طہٰ حسین نے مسلمانوں کی تاریخ کو فرانسیسی انقلاب کی طرح ایک طبقاتی جنگ ثابت کرنے کی فکری غلطی کی ہے۔

3۔ تحریر کا اسلوب:

علمی احترام اور غیر متزلزل موقف اس پورے رد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علامہ محمود شاکر، ڈاکٹر طہٰ حسین کو اپنا استاد اور عربی ادب کا بڑا نام مانتے تھے۔ انہوں نے طہٰ حسین کی فصاحت و بلاغت اور علمی مقام کا پورا احترام برقرار رکھا، لیکن جہاں بات دین، تاریخِ اسلام اور صحابہ کی ناموس کی آئی، وہاں انہوں نے انتہائی سخت، دندان شکن اور مدلل گرفت کی۔

• قاری کے لیے خلاصہ

❐ اگر آپ ڈاکٹر طہٰ حسین کی کتاب پڑھ رہے ہیں، تو یہ یاد رکھیں کہ وہ فتنے کا سبب "اندرونی معاشی و سیاسی بگاڑ" کو قرار دیتے ہیں۔ جبکہ علامہ محمود شاکر اس کے برعکس یہ سمجھاتے ہیں کہ وہ فتنہ کوئی اندرونی طبقاتی جنگ نہیں تھی، بلکہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے ایک "منظم بیرونی و فکری سازش" تھی جس کا شکار کچھ سادہ لوح مسلمان بنے۔ علامہ محمود شاکر کا رد

پڑھے بغیر طہٰ حسین کی کتاب کا مطالعہ قاری کو گمراہ کن فکری الجھن میں ڈال سکتا ہے۔

❶ الفتنة الكبریٰ (فتنۂ اکبر)

محمود شاکر رحمہ اللہ کی کتاب ""جمھرۃ المقالات"" میں ""الفتنۃ الکبری"" (تاریخِ اسلام کا وہ نازک دور جس میں سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے ادوارِ خلافت میں داخلی اختلافات رونما ہوئے) کے عنوان سے ایک انتہائی گرانقدر، گہرا اور علمی مقالہ موجود ہے جس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

میں نے ڈاکٹر طہ حسین کی تصنیف کردہ کتاب الفتنۃ الکبریٰ کے مطالعے میں جلدی سے کام لیا؛ اس لیے کہ صدرِ اول (اسلام کے ابتدائی دور) کی جلیل القدر ہستیوں میں سے کسی شخصیت پر لکھی جانے والی یہ ان کی پہلی کتاب تھی، اور وہ شخصیت امیر المؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ عثمان بن عفان کی تھی۔ میں چونکہ علم و تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کے بلند مرتبے اور کلام کی تخریج و تنقیح میں ان کی شاندار مہارت اور حسنِ تدبیر سے بخوبی واقف تھا، اس لیے مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اس کتاب کو ایسے علمی جواہر سے مالامال کردیں گے جو اس عظیم شخصیت کے شایانِ شان ہو، اور اس فتنے کی سنگینی اور نزاکت کے ہم پلہ ہو جس کی بھیانک آگ ان کے دورِ خلافت کے اواخر میں بھڑک اٹھی تھی، اور جس کا انجام خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ایک ایسے ہولناک قتل پر ہوا جس سے زیادہ قبیح اور وحشت ناک واقعے سے تاریخِ اسلام کبھی آشنا نہیں ہوئی تھی۔

کتاب کا پہلا لفظ پڑھنے سے بھی قبل میں نے اپنے دل میں کہا: طہ حسین ان باہم خلط ملط اور ہیجان انگیز واقعات کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے بہترین فرد ہیں، اور اس فتنے کی پیچیدہ اور تاریک گھاٹیوں میں صائب ترین رائے اور قطعی و واضح بیان کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے سب سے موزوں شخصیت ہیں۔ ایک طویل عرصے سے لوگ اس تاریک فتنے کے بیابان میں بھٹکتے رہے ہیں، اور ایک مدت سے مصنفین و مورخین اس عظیم اور ہولناک واقعے کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھاتے آئے ہیں، اور زمانۂ قدیم سے لوگ ان مسلمانوں کے معاملے میں حیرت و استعجاب کا شکار رہے ہیں جنھوں نے اپنے خلیفہ کو اس طرح ذبح کر ڈالا جیسے کوئی مظلوم بھیڑ ذبح کی جاتی ہے؛ غرض ماضی اور حال میں لوگوں نے جب کبھی اس موضوع پر بحث کی ہے، تو وہ ایسے گمراہ کن راستوں پر ہی چلے ہیں جن میں رات کو سفر کرنے والا کوئی مسافر نہ تو کسی ایسے نشانِ منزل تک پہنچ پاتا ہے جو اسے سیدھی اور کھلی شاہراہ پر لے جائے، اور نہ ہی اسے کسی معلوم مقصد کا سراغ ملتا ہے۔

میں نے اس کتاب کے مطالعے میں اپنے دل و دماغ کو پوری طرح جھونک دیا، جب کہ میرا دل اسی کامل اعتماد سے سرشار تھا جس کا میں نے ذکر کیا، اور میری روح اسی امید سے وابستہ تھی جس کی میں نے تمنّا کی تھی۔ لیکن ابھی میں اس کتاب کو مکمل کرنے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کتاب میرے ہاتھوں میں لرز رہی ہو اور اس کا سارا تانا بانا بکھر رہا ہو۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ قاری کو یہ معلوم ہو کہ یہ کتاب میرے ہاتھوں میں کیوں لرز اٹھی؛ کیونکہ یہ ایک طویل داستان ہے، اگر میں اسے سنانا شروع کر دوں تو مجھے خود معلوم نہ ہو گا کہ اس کا اختتام کہاں جا کر ہو گا۔ چنانچہ میں اس داستان کو قاری سے چھپا کر لپیٹ رہا ہوں؛ کیونکہ میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ اس کے دل کو جس طمأنیت، امن اور رضا پر وہ قائم ہے، اسی پر برقرار رہنے دوں۔ اور میں یہ طرزِ عمل اختیار کر رہا ہوں خواہ قاری خود یہ چاہے کہ میں اس لپیٹے ہوئے راز کو فاش کر دوں، اور خواہ وہ اپنے نفس کے لیے اس اطمینان، امن اور سکون کو ناپسند ہی کیوں نہ کرے۔ قاری کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میرے ساتھ اس کتاب کے صرف دو مقامات پر نظر ڈالے، جن پر میرا تعجب نہ کبھی ختم ہوا ہے اور نہ کبھی ختم ہو گا، اور جب قاری کو بھی ان دونوں مقامات کی حقیقت معلوم ہو گی تو اس کی حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ رہے گی۔

میں اپنے قلم کو تھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں بسبیلِ تزلزل (یعنی محض بحث اور مروجہ علمی اصول کے طور پر) یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ اپنے اجمال اور تفصیل سمیت بالکل درست ہے؛ اور وہ تصویر جو انہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، ان کے اصحاب اور ان کے معاصرین کی تاریخ کے حوالے سے کھینچنا چاہی ہے، وہ بھی اپنی کلیات و جزئیات کے ساتھ بالکل صحیح ہے۔ میں اس سے بھی بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں ان تمام باتوں میں سے کسی بھی چیز میں ان سے ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں کرتا، اور اگر میں خود عثمان رضی اللہ عنہ اور اس فتنے کی تاریخ لکھنے بیٹھتا، تو اس خبیث فتنے کا ذکر کرتے ہوئے وہی بات کہتا جو انہوں نے صفحہ ۱۰۹ پر کہی ہے، جہاں وہ لکھتے ہیں:

"پس یہ فتنہ دراصل ایک خالص عربی فتنہ تھا، جو دولت مندوں کے درمیان مال و دولت اور اقتدار کی باہمی کشمکش، اور ان امیروں کے خلاف عرب کے عام لوگوں کے حسد و رقابت کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔"

آپ کے لیے یہ نہایت موزوں ہوگا کہ آپ اس صفت یعنی "عربی فتنہ" اور "عرب کے عام لوگ" کی اس تکرار پر گہری نظر ڈالیں، تاکہ آپ جان سکیں کہ وہ اس تکرار سے کیا مراد لینا چاہتے ہیں، اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ

کے خونِ ناحق میں عربوں کے سوا کسی اور غیر عرب کی شرکت کی نفی کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً آپ کے لیے یہی مناسب، سزاوار اور لازم ہے کہ آپ ایسا ہی کریں اور اس پر خوب غور و فکر اور طویل تدبر سے کام لیں؛ کیونکہ آپ تھوڑی ہی دیر بعد ایک بالکل اچھوتی، نئی اور نہایت دلکش بات سے روشناس ہونے والے ہیں۔ ابھی آپ چند صفحات ہی آگے بڑھیں گے کہ صفحہ ۱۳۱ پر ایک نیا باب سامنے آئے گا جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

وہاں ایک ایسی داستان بھی ہے جس کی اہمیت کو (متاخرین) راویوں نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور اس میں اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے کہ بہت سے متقدمین اور جدید مورخین نے اسے عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پیدا ہونے والے تمام تر اختلافات کا اصل سرچشمہ قرار دے دیا، اور اسی اختلاف نے مسلمانوں کے درمیان وہ تفرقہ پیدا کیا جس کے اثرات آج تک مٹائے نہیں جا سکے۔ یہ داستان عبداللہ بن سبا کی ہے، جو ابن السوداء (سیاہ فام عورت کا بیٹا) کے نام سے معروف ہے۔ راویوں کا کہنا ہے کہ: عبداللہ بن سبا صنعاء کا ایک یہودی تھا جس کی ماں حبشی تھی، وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بظاہر اسلام لایا، پھر وہ مختلف شہروں اور صوبوں میں گھومنے لگا تاکہ خلیفہ کے خلاف سازشوں کے جال بنے، لوگوں کو ان کے خلاف ابھارے

اور اکسائے، اور عوام میں ایسے بدعتی افکار و نظریات پھیلائے جنہوں نے دین اور سیاست دونوں کے بارے میں ان کی رائے کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ پھر وہ کہتے ہیں: اور اسی ابن السوداء کی طرف بہت سے لوگ ان تمام خرابیوں اور اختلافات کو منسوب کرتے ہیں جو عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی قلمرو میں ظاہر ہوئے تھے، بلکہ ان میں سے بعض کا تو یہ بھی ماننا ہے کہ اس نے اپنی سازش کو نہایت مضبوطی سے منظم کیا تھا، چنانچہ اس نے مختلف شہروں میں خفیہ جماعتیں تیار کیں جو پردۂ راز میں رہ کر سازشیں کرتی تھیں اور آپس میں ایک دوسرے کو فتنے کی دعوت دیتی تھیں، یہاں تک کہ جب حالات ان کے سازگار ہو گئے، تو انہوں نے خلیفہ پر ہجوم کر دیا اور پھر خروج، محاصرے اور خلیفہ کے قتل کا وہ واقعہ رونما ہوا جو ہونا تھا۔

پس آپ اس کلام میں بخوبی دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکٹر طہ حسین نے کچھ ہی دیر پہلے اس بات پر کیوں اصرار کیا تھا کہ وہ اس فتنے کو "عربی" فتنہ قرار دیں، اور یہ واضح کریں کہ جو عام لوگ اس فتنے کا ایندھن بنے وہ "عرب کے عام لوگ" تھے؛ یعنی ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اس خبیث یہودی عبداللہ بن سبا کا اس فتنے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا، اور نہ ہی اس کی آگ کو بھڑکانے میں یہودیوں کا کوئی کردار تھا۔ یہ ایک بالکل ظاہر اور کھلا ہوا استدلال ہے، جس میں ہمارے

علم کے مطابق کوئی بھی ہم سے اختلاف نہیں کرتا، اور خود ڈاکٹر طہ حسین کو بھی اس سے کوئی انکار نہیں ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے فوراً بعد کہتے ہیں:

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ ابنِ سبا کے معاملے کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، وہ اپنے نفس پر اور تاریخ پر بہت سخت زیادتی اور حد سے زیادہ مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔ اور سب سے پہلی بات جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم ابنِ سبا کا کوئی تذکرہ ان اہم مآخذ و مراجع میں نہیں پاتے جنہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پیدا ہونے والے اختلافات کے واقعات کو نقل کیا ہے؛ چنانچہ ابنِ سعد نے جب عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت اور ان کے خلاف لوگوں کی بغاوت و سرکشی کا ذکر کیا، تو وہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اسی طرح بلاذری نے بھی انساب الاشراف میں اس کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ میری رائے میں یہ کتاب اس داستان کے لیے سب سے اہم اور سب سے زیادہ مفصل ماخذ ہے۔ البتہ طبری نے اس کا تذکرہ سیف بن عمر کی روایت سے کیا ہے، اور بظاہر ان کے بعد آنے والے تمام مورخین نے یہ روایت انہی سے اخذ کی ہے۔

میں اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پا رہا ہوں کہ آپ کے سامنے ڈاکٹر صاحب کا وہ کلام بھی نقل کروں جو انہوں نے اس کے بعد اپنی رائے کو ترجیح دینے اور اپنی دلیل کو واضح کرنے کے لیے کہا ہے، انہوں نے کہا:

میں نہیں جانتا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ابنِ سبا کی کوئی حیثیت یا اہمیت تھی بھی یا نہیں؟ لیکن میں اس بات پر قطعی یقین رکھتا ہوں کہ اس کی حیثیت، اگر کوئی تھی بھی، تو وہ اس قابل نہ تھی کہ اسے کوئی اہمیت دی جاتی۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان ایسے نہ تھے کہ اہل کتاب میں سے کوئی نووارد شخص، جو عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں اسلام لایا ہو، وہ ان کی عقلوں، ان کی آرا اور ان کی سلطنت کے ساتھ کھلواڑ کر جاتا۔۔۔ اور اگر عبداللہ بن عامر یا معاویہ رضی اللہ عنہما نے اس نووارد کو پکڑ لیا ہوتا جو کہ ایک یہودی تھا اور جس نے مسلمانوں کے خلاف سازش کے سوا کسی اور مقصد کے لیے اسلام قبول نہیں کیا تھا، تو ان دونوں میں سے کوئی ایک یا یہ دونوں اس کے بارے میں عثمان رضی اللہ عنہ کو خط لکھ دیتے، اور ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی اس پر سخت گرفت کر لیتے۔ اور اگر اسے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے پکڑ لیا ہوتا، تو وہ اسے اس سزا سے ہرگز معاف نہ کرتے جو وہ دونوں محمدوں (محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ) کو دینے ہی والے تھے، اگر

انہیں عثمان رضی اللہ عنہ کا خوف مانع نہ ہوتا۔۔۔اور گورنروں کے لیے اس سے زیادہ آسان کوئی کام نہ تھا کہ وہ اس نووارد کا پیچھا کرتے،اسے گرفتار کرتے اور سزادیتے۔

پھر وہ صفحہ ۱۳۴ پر کہتے ہیں:

پس ہمیں اس سب کے مآخذ پر تحفظ، احتراز اور حد درجہ احتیاط کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اور ہمیں صدرِ اسلام کے مسلمانوں کو اس بات سے بہت بلند و برتر سمجھنا چاہیے کہ صنعاء سے آنے والا ایک ایسا شخص ان کے دین، ان کی سیاست، ان کی عقلوں اور ان کی حکومت کے ساتھ کھلواڑ کر جائے، جس کا باپ یہودی اور ماں سیاہ فام تھی، اور وہ خود بھی یہودی تھا پھر وہ کسی رغبت یا خوف کے بغیر بلکہ محض مکر، سازش اور فریب کاری کے لیے بظاہر اسلام لایا، پھر اسے اس کامیابی سے بھی نواز دیا گیا جس کی وہ تمنا رکھتا تھا، یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کو ان کے خلیفہ کے خلاف اکسایا اور انہوں نے انہیں شہید کر ڈالا۔

پھر وہ کہتے ہیں:

یہ سب ایسی باتیں ہیں جو عقل کے ترازو میں پوری نہیں اترتیں، نہ ہی علمی نقد و جرح کے سامنے ٹھہر سکتی ہیں، اور تاریخ کے حقائق کی بنیاد ان جیسی باتوں پر رکھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب یک لخت اور حتمی طور پر اپنی رائے کا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں!!

یہ تو پہلا مقام ہے، رہا دوسرا مقام تو وہ اس معاملے کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا تعلق رکھتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسے اس سے بالکل الگ تھلگ کر دیا؛ چنانچہ انہوں نے صفحہ ۱۳۴ کو وہیں چھوڑا اور اس جلیل القدر تحقیق میں اپنے اسی رخ پر آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہ صفحہ ۲۰۹ پر پہنچ گئے تاکہ وہاں یہ کہہ سکیں:

یہاں اس خط کی داستان سامنے آتی ہے جس کے بارے میں راویوں کا کہنا ہے کہ مصریوں نے اسے مصر واپس لوٹتے ہوئے پکڑ لیا تھا، جس پر وہ دوبارہ مدینہ واپس آ گئے۔ پس میری رائے میں یہ داستان اپنی جڑ بنیاد سے ہی بالکل من گھڑت ہے۔

پھر انہوں نے اس خط کی کہانی کا انتہائی اختصار کرتے ہوئے کہا:

یہ سارا قصہ کسی حقیقی واقعے کے بجائے ایک بے ہودہ اور لغو ناٹک سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ حالانکہ اصل معاملہ اس سے کہیں زیادہ سادہ تھا۔ مختلف شہروں کے لوگوں نے اپنے خلیفہ سے ایک وعدہ پایا جس پر وہ مطمئن ہو گئے، پھر بعد میں انہیں یہ معلوم ہوا کہ خلیفہ نے اپنے وعدے کو سچا نہیں

کیا! چنانچہ وہ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے دوبارہ آ پہنچے تاکہ اس معاملے کا یکسر فیصلہ کر دیں اور اس وقت تک واپس نہ لوٹیں جب تک اس سے پوری طرح فارغ نہ ہو جائیں۔

پھر ڈاکٹر صاحب پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مصر کے گورنر کی طرف بھیجے گئے اس خط کا سرے سے انکار کر دینا — جس میں اسے مصر سے آنے والے وفد کے سرکردہ لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا — اس الجھن کو حل نہیں کرتا کہ آخر یہ وفد مدینہ سے رخصت ہو کر مصر کی طرف روانہ ہونے کے بعد اچانک واپس کیسے پلٹ آیا؟ نیز ان پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ انہوں نے جو یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ مختلف شہروں کے لوگوں پر یہ بات کھل گئی تھی کہ خلیفہ نے اپنا وعدہ سچا نہیں کیا، یعنی انہوں نے ان سے صریح جھوٹ بولا تھا، ایک ایسی بات ہے جو کسی طرح بھی قابل قبول اور ہضم ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ آخر ان لوگوں پر یہ کیسے کھلا کہ خلیفہ نے ان سے جھوٹ بولا ہے؟ تو انہیں کوئی جواب نہ سوجھا۔ لہٰذا انہوں نے اس نظریے کو جوں کا توں ہی رہنے دیا اور اس پر مزید یہ اضافہ کر دیا کہ وہ لوگ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے دوبارہ چڑھ آئے۔

پس جب وہ مدینہ پہنچے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو اپنے ساتھ جنگ کے لیے تیار پایا، چنانچہ انہوں نے اس لڑائی کو ناپسند کیا اور ایک مکر وسازش کے تحت بظاہر واپس لوٹ گئے؛ یہاں تک کہ جب انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ان بزرگ صحابہ نے اپنے ہتھیار رکھ دیے ہیں اور وہ اپنے گھروں میں پرامید ومطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں، تو وہ یکایک پلٹے اور بغیر کسی جنگ کے مدینہ پر قابض ہو گئے۔

لیکن ڈاکٹر طہ حسین نے — جو آرا اور نظریات قائم کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں — یہ دیکھا کہ یہ پورا نظریہ بالکل ناقص اور عیب دار رہ جائے گا اگر اس کی تائید کسی دوسرے نظریے سے نہ کی جائے؛ چنانچہ انہوں نے خوب سوچ بچار کی اور اندازے لگائے، پھر نظر دوڑائی اور کہا:

میں تو اس بات پر یقین کے قریب ہوں کہ خود مدینہ والوں میں سے بھی کچھ لوگ ان کے مددگار بنے ہوئے تھے، جنہوں نے انہیں بلایا اور ان کا حوصلہ بڑھایا، پھر انہیں ان فیصلوں اور ارادوں سے بھی باخبر کیا جو اصحابِ نبی نے کیے تھے، اور بعد میں انہیں یہ اطلاع بھی دی کہ اب مدینہ دوبارہ پرامن اور پرسکون ہو چکا ہے؛ اور پھر جب ان لوگوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا، تو یہ مدنی معاونین بھی ان کے ساتھ جا ملے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب محض مفروضے اور خیالی تصورات ہیں، اور ساتھ ہی اس بات کا اعتراف بھی ہے جس کا انہوں نے عبداللہ بن سبا کے معاملے میں انکار کیا تھا، یعنی ایسی (خفیہ جماعتوں) کی تنظیم جو پردۂ راز میں رہ کر سازشیں کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ وہاں تو اس اصول کا انکار کرتے ہیں اور یہاں خود اس کا اقرار کر رہے ہیں!! پھر ڈاکٹر صاحب پے در پے ایک کے بعد دوسرا مفروضہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ آپ کو یہ دکھا دیں کہ معاملات اچانک کس طرح پیچیدہ ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آگیا۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان واقعات کا ایسا عجیب و غریب اور حیرت انگیز اختصار کیا ہے جس کی نظیر ان کی کسی دوسری تحریر، مفروضے یا دعوے میں نہیں ملتی جہاں انہوں نے کسی معاملے میں اتنی حتمی اور قطعی رائے قائم کی ہو؛ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے عربی زبان کے وہ اکثر قارئین بخوبی واقف ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے لکھنے کی ابتدا سے لے کر اب تک ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔

میں آپ کو ان دو مقامات کے علاوہ کسی اور چیز پر روکنا نہیں چاہتا، کیونکہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلام کی بال کی کھال نکالنے میں طوالت اختیار کرنا ناپسند

ہے، مبادا یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہو؛ کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے ہر ہر حرف کے نیچے علم کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس کی باریک بینی سے تفتیش کرنا، اسے چھاننا اور اسے حق کے ان رخوں کی طرف واپس موڑنا ناگزیر ہے جن سے وہ ہٹ کر کہیں اور نکل گیا ہے۔ اور آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہم ان عبارتوں کے نقل میں طوالت اختیار کرنے پر بالکل مجبور ہو گئے تاکہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کے مغز اور ان کے علم کا کوئی حصہ بھی آپ سے اوجھل نہ رہ جائے۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی گفتگو کا آغاز اس یہودی، ابنِ سوداء عبداللہ بن سبا کے قصے کو بے بنیاد ثابت کرنے سے کیا؛ انہوں نے یہ ذکر کیا کہ "بعد کے راویوں" نے اس کے معاملے کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اس میں غلو سے کام لیا، اور یہ کہ اس کا تذکرہ اہم مآخذ میں نہیں آیا، اور یہ کہ ابنِ سعد نے اس کا ذکر نہیں کیا، اور بلاذری نے انساب الاشراف میں اسے بیان نہیں کیا (حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں یہ سب سے اہم ماخذ ہے)، اور جس نے اس کا تذکرہ کیا ہے وہ صرف طبری ہیں "اور بظاہر ان کے بعد آنے والے مورخین نے یہ روایت انہی سے اخذ کی ہے" جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے۔

① ڈاکٹر صاحب کا اپنی بات کا آغاز اس جملے سے کرنا کہ "بعد کے راویوں" (الرواۃ المتاخرین) نے ایسا کیا، اس میں شدید قسم کا التباس اور ابہام پیدا کیا گیا ہے، جو بظاہر قصداً ہے!! کیونکہ ابنِ جریر طبری بعد کے راویوں اور مؤرخین میں سے نہیں ہیں؛ وہ تو ۲۲۵ہجری میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ہجری میں وفات پائی، چنانچہ وہ (بلاذری) کے ہم عصر ہیں اور کتاب الطبقات کے مصنف ابنِ سعد کے شاگردوں کے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔

② یہ کہ سیف بن عمر — جن سے امام طبری نے یہ روایت نقل کی ہے — وہ قدیم مؤرخین کے بڑے ائمہ میں سے ہیں؛ وہ امام طبری اور بلاذری کے شیوخ کے بھی شیوخ ہیں، اور ابنِ سعد کے شیوخ کے ہم مرتبہ ہیں۔ ان کا انتقال ہارون رشید کے دور میں ہوا، یعنی سن ۱۹۰ہجری سے پہلے۔ چنانچہ نہ ان کے بارے میں اور نہ ہی امام طبری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "بعد کے راویوں" میں سے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر طہ حسین نے اپنے قارئین کو دھوکے اور التباس میں رکھنا چاہا ہے۔

③ ڈاکٹر صاحب کا اہم مآخذ کا تذکرہ کرنا، اس میں بھی شدید قسم کا التباس اور ایک بہت بڑی ناانصافی پائی جاتی ہے؛ کیونکہ اگر امام طبری کی کتاب تاریخِ

طبری ان کے نزدیک اہم مآخذ میں شمار نہیں ہوتی، تو کاش میں جان سکتا کہ پھر وہ کون سے اہم مآخذ ہیں جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں؟

④ ڈاکٹر طہ حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ ابنِ سعد کی کتاب الطبقات الکبریٰ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، وہ ایک نامکمل کتاب ہے، اور یہ مختلف نسخوں کو ملا کر تیار کی گئی ہے جن میں سے کچھ مکمل ہیں، کچھ ادھورے ہیں اور کچھ مختصر ہیں۔ اور اس بات کی سب سے بڑی دلیل — جس معاملے پر ہم گفتگو کر رہے ہیں — یہ ہے کہ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی ۸۴ صفحات پر بیان کیے ہیں، اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ۳۴ صفحات پر؛ لیکن جب باری عثمان رضی اللہ عنہ کی آئی، اور ان کے دورِ خلافت کے واقعات و حادثات وہی ہیں جنہیں ڈاکٹر طہ بھی جانتے ہیں اور لوگ بھی جانتے ہیں، تو ان کے بارے میں صرف ۲۲ صفحات لکھے؛ اور جب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا — جبکہ ان کے زمانے کے حالات اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین اور بھاری تھے — تو ان کے بارے میں صرف ۱۶ صفحات لکھے۔ اس کے علاوہ، شخصیات کی سوانح کے بارے میں ابنِ سعد کے طریقہ کار کا معاملہ، عام تاریخ نویسی سے بالکل الگ ہے؛ انہوں نے اس باب میں ان امور کا بہت ہی کم تذکرہ کیا ہے جن کا لکھا جانا اس صورت میں ناگزیر ہوتا اگر انہوں نے اپنی یہ

کتاب کسی عام تاریخ پر لکھی ہوتی، نہ کہ شخصیات کے سوانح پر۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ڈاکٹر طہٰ حسین بلاشبہ اور یقیناً بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

⑤ یہ کہ ملعون یہودی عبداللہ بن سبا کی روایت کی نفی میں ڈاکٹر صاحب کی ایک دلیل یہ تھی کہ بلاذری نے اسے ذکر نہیں کیا، جبکہ ان کی اپنی رائے میں بلاذری کی کتاب اس پورے قصے کے لیے سب سے اہم اور سب سے زیادہ تفصیل والی کتاب ہے؛ لیکن پھر انہوں نے پلٹ کر اس خط والے واقعے کا بھی انکار کر دیا جس میں مصر کے وفد کے سرکردہ لوگوں کو قتل کرنے کا حکم تھا، حالانکہ بلاذری نے اسے ذکر کیا ہے، بلکہ طویل بحث کی ہے اور اس میں وہ کچھ لے کر آئے ہیں جو ان کے علاوہ کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ منطق کیسے درست ہو سکتی ہے کہ وہ کسی روایت کو بلاذری کے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے باطل قرار دیں، اور پھر اسی دوسری روایت کا بھی انکار کر دیں جسے بلاذری نے خود ذکر کیا ہو اور اس میں گہرائی تک گئے ہوں؟

یہ پانچوں باتیں ایسی ہیں جنہیں ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیان کرتے ہوئے یا ان پر ان سے بحث کرتے ہوئے مجھے خود شرم آتی تھی؛ کیونکہ یہ باتیں اس قدر واضح اور عیاں ہیں کہ ان جیسے ایک جہاندیدہ، امورِ علم کے شناور اور علم پر گہری و بہترین بصیرت رکھنے والے شخص سے پوشیدہ نہیں رہ

سکتیں۔ لیکن اب صرف ایک بات باقی رہ گئی ہے، جس کے بارے میں، میں دل سے چاہتا ہوں کہ کاش کسی دن مجھے اس کی حقیقت معلوم کرنے کا موقع مل سکے، اور وہ یہ ہے: کیا قدیم زمانے میں بلاذری کے اصل متن کے اندر اس ملعون یہودی عبداللہ بن سبا کا ذکر موجود تھا جو بعد میں کتاب سے ساقط ہو گیا یا اسے ساقط کر دیا گیا؟ اور یہ موقع مجھے تب ہی مل سکتا ہے جب میرا گزر کتاب انساب الاشراف کے کسی قدیم اور مستند قلمی نسخے پر ہو؛ کیونکہ یہ نسخہ جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ تو یروشلم میں چھپا ہے، اور اسے صیہونیت کے سرکشوں میں سے ایک شخص نے شائع کیا ہے، اور اس پر ایک ایسا مقدمہ لکھا ہے جو نہ تو عربی میں ہے اور نہ انگریزی میں، بلکہ عبرانی زبان میں لکھا گیا ہے!

ڈاکٹر صاحب ہمیں اس بات کی پوری اجازت دیں کہ ہم اس صہیونی یہودی کی دیانت پر شدید ترین شک کا اظہار کریں جس نے اس کتاب کو یروشلم میں صہیونیت کے چھاپہ خانوں سے شائع کیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ہم ایک اور شخص کو بھی دیکھ چکے ہیں جس پر کسی زمانے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے لطف و کرم اور خصوصی توجہ کا سایہ قائم کیا تھا اور اسے جامعہ مصریہ (قاہرہ یونیورسٹی) میں مدعو کیا تھا، اور وہ خود کو "ابو ذؤیب" اسرائیل ولفسن کہلاتا تھا (اور وہ اس وقت فلسطین میں صیہونیت کی راہ میں سرگرم عمل ہے)، چنانچہ

اس نے جزیرہ نما عرب میں یہودیوں کی تاریخ پر ایک کتاب تالیف کی جو مصر میں شائع ہوئی، ڈاکٹر طٰہ حسین نے اس کا مقدمہ لکھا جس میں انہوں نے اس کی بے انتہا اور مبالغہ آمیز تعریف کی؛ اس سب کے باوجود، ہم نے خود ان اخبار و احادیث میں صریح تحریف، عبارات کی کاٹ چھانٹ اور محفوظ و معروف نصوص سے انحراف پایا جو اس نے نقل کی تھیں۔ تو کیا ہمارے لیے کم از کم اس بات کا شک کرنے کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ بلاذری کی کتاب کو شائع کرنے والے اس دوسرے یہودی نے بھی بالکل ایسا ہی کیا ہو؟ ہم تو کم از کم اس معاملے میں شدید شک کا اظہار کرتے ہیں اور توقف سے کام لیتے ہیں۔ مزید یہ کہ تصنیف و تالیف کا قدیم طریقہ کار، اور بالخصوص وہ انداز جس پر بلاذری کی یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ مصنف کسی بات کو ایک جگہ چھوڑ دیتا ہے اور پھر اسے کسی دوسری جگہ ذکر کر دیتا ہے، جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ اسے پہلی ہی جگہ بیان کرتا۔ اور یہ ایک ایسا اسلوب ہے جسے ڈاکٹر صاحب بھی اسی طرح جانتے ہیں جیسے ہم جانتے ہیں، بلکہ ہم سے بھی بہتر جانتے ہیں۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بلاذری نے عبداللہ بن سبا کا ذکر — مثال کے طور پر — (عمار بن یاسر)، (محمد بن ابی بکر)، (محمد بن ابی حذیفہ) کے حالاتِ زندگی میں، یا اس فتنہ و آشوب میں حصہ لینے والے کسی اور شخص کے تذکرے میں کر

دیاہو؟ڈاکٹر صاحب خود یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ بلاذری کی کتاب کا جو حصہ اب تک مل سکا ہے، وہ ایک بہت ہی معمولی اور چھوٹا سا حصہ ہے؛ جس کا ایک جزو ۱۸۸۳ عیسوی میں جرمنی میں چھپا تھا، پھر صہیونی یہودی نے اس کے ایک دوسرے جزو کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی جس میں عثمان رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی درج ہیں اور یہ ۱۹۳۶ عیسوی میں شائع ہوا؛ پھر اس کا ایک اور جزو ۱۹۳۸ عیسوی میں چھپا جس کے ناشر نے عربی میں لکھے گئے اپنے مقدمے میں یہ صراحت کی ہے کہ کچھ ایسے واقعات جو یزید بن معاویہ کے عہد میں پیش آئے—یعنی سانحۂ کربلا اور حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت —انہیں یزید کے سوانح میں ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ مصنف نے ان دونوں کا تذکرہ آلِ ابی طالب کے تراجم میں کیا ہے،اور یہ خود اس کتاب کے اسلوب اور شجرہ ہائے نسب کے تسلسل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے جیسا کہ اس نے بعینہ اپنے الفاظ میں لکھا ہے۔ تو پھر کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ بلاذری نے عبداللہ بن سبا کے معاملے کو کسی دوسری جگہ ضم کر دیا ہو، بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے ان واقعات کے ساتھ کیا جن کا مشاہدہ اور تذکرہ خود اس یہودی ناشر نے کیا ہے؟ یہ سب کچھ ممکن ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب جب کسی چیز کی نفی کرنا چاہتے ہیں تو وہ ان تمام حقائق سے گزر جانے اور ان سے آنکھیں بند

کر لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، تاکہ وہ اس معاملے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ اور توقف کے اپنی اسی رائے کا اظہار کر سکیں جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں اور جسے وہ پسند کرتے ہیں۔

پھر ڈاکٹر صاحب یہ بات کیسے بھول گئے کہ جس شخص نے کوئی روایت نقل نہ کی ہو، وہ اس شخص کے خلاف کوئی دلیل یا حجت نہیں بن سکتا جس نے اس روایت کو نقل کیا ہے؛ بالخصوص جب دونوں شخصیات ایک ہی طبقے اور عہد سے تعلق رکھتی ہوں جیسے بلاذری اور امام طبری؟ بلکہ شاید امام طبری ان دونوں میں زیادہ قوی، زیادہ عالم اور تاریخ کا زیادہ گہرا فہم و ادراک اور اس کا ذخیرہ رکھنے والے ہیں۔ یہ امام طبری ہی ہیں جن کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے اصحاب سے پوچھا: ''کیا تم قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کے لیے مستعد اور تیار ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: ''وہ حجم میں کتنی ہوگی؟'' فرمایا: ''تیس ہزار صفحات۔'' اس پر انہوں نے کہا: ''یہ تو ایسا کام ہے جس کی تکمیل سے پہلے ہی عمریں فانی ہو جائیں گی۔'' تو انہوں نے ان کے لیے اس کا اختصار فرما کر اسے تین ہزار صفحات میں سمیٹ دیا۔ پھر انہوں نے اپنے اصحاب سے پوچھا: ''کیا تم حضرت آدم سے لے کر ہمارے اس موجودہ وقت تک کی تاریخِ عالم لکھنے کے لیے تیار ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: ''اس کا حجم کتنا ہوگا؟'' تو

آپ نے بالکل ویسا ہی حجم بتایا جیسا تفسیر کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے پھر وہی پہلے جیسا جواب دیا، تو آپ نے فرمایا: انا للہ و انا الیہ راجعون!! لوگوں کی ہمتیں مر چکیں!۔

جس کسی نے بھی امام طبری کی تاریخ کیکتاب یا ان کی تفسیر کا مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ بالکل سچ ہے؛ اور یہ کہ یہ شخص علم کے لیے بالکل یکسو اور وقف تھا، کوئی بھی چیز انہیں علم سے کبھی غافل نہ کر سکی، اور انہوں نے کسی بھی چھوٹی بڑی یا ادھر ادھر کی بات کو نہیں چھوڑا مگر یہ کہ اس کی پوری کھوج لگائی، اس کی تحقیق کی اور اس میں ایسی رائے قائم کی جسے شاید ہی کبھی رد کیا جا سکے۔ ان کے اور بلاذری کے درمیان جو فرق ہے، اس علم تاریخ کی بصیرت رکھنے والا کوئی بھی شخص اس میں خطا نہیں کھا سکتا؛ چنانچہ ہمارے اس دور میں یہ کہنا کسی بھی طرح سے دلیل نہیں بن سکتا کہ چونکہ بلاذری نے اسے ذکر نہیں کیا، اس لیے امام طبری کی بیان کردہ روایت کو رد کرنے کے لیے یہی بات کافی ہے۔ اور یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جو کسی طویل بحث و تکرار کی محتاج نہیں۔

چنانچہ، ڈاکٹر صاحب نے حد سے تجاوز کیا ہے اور ایک ایسی راہ اختیار کی ہے جو ان جیسے شخص کے شایانِ شان نہیں، جب انہوں نے عبداللہ بن سبا کے

واقعے اوراس خط والے واقعے کی نفی کی جس میں مصریوں کے قتل کا حکم تھا؛اور یہ سب کچھ علمی تحقیق میں ان کے اسلوب کے اسی کھوکھلے پن کے بعد سامنے آیا ہے جسے آپ دیکھ چکے ہیں۔اوراس طرح ڈاکٹر صاحب نے اخبار وروایات کی نفی کرنے اور بنا کسی دلیل کے انہیں جھٹلانے میں اہلِ تحقیق کے طریقے سے ہٹ کر علم اور علماء کی روایت کی صریح مخالفت کی ہے، بلکہ انہوں نے بلاذری کی فضیلت اورامام طبری پران کی برتری کے بارے میں بنا کوئی دلیل پیش کیے، کتب کی اشاعت کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیے بغیر، اور خود ان کتب کا — جیسا کہ ابنِ سعد اور بلاذری دونوں کے معاملے میں کہا گیا — گہرا مطالعہ کیے بغیر محض اپنی من مانی رائے مسلط کی ہے۔اس لیے اب ہمارے لیے پورا حق بنتاہے کہ ہم یہاں خود ڈاکٹر طہ حسین کا وہ جملہ نقل کریں جو انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا ذکر کرتے ہوئے، ان کے باہمی اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے، اور یہ دعویٰ یا گمان کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے پر کبیرہ گناہوں کی تہمتیں لگائیں اور آپس میں قتال کیا؛ اور یہ زعم ظاہر کیا تھا کہ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم ان کے بارے میں ان کے اپنے بارے میں قائم کردہ نظریات سے بہتر رائے رکھیں، چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷اپر لکھا تھا:

ہمارے لیے یہ ہر گز مناسب نہیں کہ ہم ان لوگوں کی راہ پر چلیں جو صحابہ کے باہمی فتنے اور اختلاف کے بارے میں ہم تک پہنچنے والی اکثر روایات کو جھٹلاتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے ایسا کیا، تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم بعثتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک کی پوری اسلامی تاریخ کو ہی جھٹلا بیٹھیں؛ اس لیے کہ جن لوگوں نے ان فتنوں کی روایات نقل کی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے فتوحات کی روایات، غزوات کے احوال اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کی سیرت کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل مناسب نہیں کہ جب وہ ایسی روایات بیان کریں جو ہمیں بھلی لگتی ہوں تو ہم ان کی تصدیق کر دیں، اور جب وہ ایسی باتیں روایت کریں جو ہمیں پسند نہ ہوں تو ہم انہیں جھٹلا دیں؛ اور یہ بھی کسی طرح درست نہیں کہ ہم تاریخ کے ایک حصے کو سچا مانیں اور دوسرے حصے کو جھوٹا قرار دے دیں، صرف اس بنیاد پر کہ اس کا کچھ حصہ ہمیں خوش کرتا ہے اور کچھ حصہ ہمیں تکلیف پہنچاتا ہے۔

یہ بالکل سچ ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس دلیل کو صحابہ کرام پر طعن کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی طرف ایسی فاش اور تباہ کن غلطیاں منسوب کرنے کے موقع پر توجحت بناتے ہیں، لیکن پھر اسی مروجہ رائے کو ساقط کر دیتے ہیں، اس کی کوئی پروا نہیں کرتے، اور اس فتنۂ خبیثہ کی روایات

نقل کرنے والے راویوں کو جھٹلانے کے موقع پر اس کی شدید ترین مخالفت کر بیٹھتے ہیں جس کا تانا بانا اس ملعون یہودی عبداللہ بن سبانے بنا تھا۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ہم نہیں جانتے؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں، لیکن ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ قارئین کے سامنے کوئی ایسا جلد بازی کا فیصلہ پیش کریں جس پر ہم ابھی ایسی قطعی دلیل نہ لا پائے ہوں جو اس ملعون ابن السوداء (سیاہ فام عورت کے بیٹے) کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب کے تمام دعووں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ چنانچہ قارئین کا ہم پر ایک ایسا حق ہے جس میں خیانت کرنا ہمارے لیے جائز نہیں؛ اور ان کا حق یہ ہے کہ وہ پہلے ڈاکٹر صاحب کے تمام دلائل کا بذاتِ خود جائزہ لیں، پھر اس کے بعد تسلسل کے ساتھ ہمارے دلائل کو دیکھیں، اور پھر ہم یہ فیصلہ ان کے سپرد کر دیں تا کہ وہ پورے فہم اور روشن بصیرت کے ساتھ اسے قبول کریں یا چھوڑ دیں۔ اور ہمارا وعدہ اگلا مقالہ ہے، ان شاءاللہ۔

❷ الفتنة الكبریٰ (فتنۂ اُکبر)

چنانچہ، ڈاکٹر طہٰ حسین گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ فتنۂ اُکبر (الفتنۃ الکبریٰ) جو عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر منتج ہوا، وہ محض "ایک خالص عربی فتنہ تھا جو مال و دولت اور جاہ واقتدار کے لیے صاحبِ ثروت لوگوں کے باہمی تصادم، اور ان مالداروں کے خلاف عام عربوں کے حسد ور قابت کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا" اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر؛ چنانچہ اس بڑے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے فتوحات کے بعد کے ابتدائی اسلامی دور کی تصویر کشی میں ہر وہ راہ اختیار کی جو انہیں صرف اور صرف اسی ایک مقصد تک پہنچا سکے، اور وہ مقصد ہے: مال و دولت، جاہ و اقتدار، مال و دولت اور اقتدار کے لیے صاحبِ ثروت لوگوں کا باہمی تصادم، اور ان اصحابِ مال و دولت اور اقتدار کے خلاف عام عربوں کا حسد۔ اور میں — جیسا کہ میں نے ابھی پہلے کہا — نہ تو اس تصویر کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کروں گا، اور نہ ہی اس کے رد میں کوئی ایسا کام کروں گا سوائے اس کے جو اس فتنے کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی تاریخی تحقیق کے سیاق و سباق میں ضروری ہو۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرے ہدف کو اس وقت بے نقاب کر دیا جب وہ اس فتنے کے احوال کے بیان پر پہنچے، چنانچہ انہوں نے یہودی عبداللہ بن سبا کی روایت کی

سرے سے نفی کر دی، اور اس خط کی روایت کا بھی انکار کر دیا جس میں مصر کے وفد کے سربراہوں کو قتل کرنے کا حکم لکھا ہوا تھا۔ ان کا یہ ہدف دراصل یہ ہے کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے خون اور امامِ وقت کے قتل پر اکسانے کی سازش میں یہودیوں کی شرکت کا انکار کریں؛ چنانچہ انہوں نے ایک ایسا کٹھن راستہ اختیار کیا جس میں انہوں نے روایات کی جرح کے معاملے میں علماء کے مسلمہ اسلوب کی صریح مخالفت کی، اور کسی دلیل کے بغیر ایک بات میں راویوں کو جھٹلا دیا جبکہ دوسری بات میں بنا کسی برہان کے ان کی تصدیق بھی کر دی؛ حالانکہ وہ خود اپنی کتاب میں ان لوگوں پر ملامت کرتے ہیں جو "لوگوں کے باہمی فتنے اور اختلاف کے بارے میں ہم تک پہنچنے والی روایات کو جھٹلاتے ہیں"، چنانچہ انہوں نے صفحہ ۲۷۱ پر لکھا تھا: "کیونکہ اگر ہم نے ایسا کیا، تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم بعثتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک کی پوری اسلامی تاریخ کو ہی جھٹلا بیٹھیں؛ اس لیے کہ جن لوگوں نے ان فتنوں کی روایات نقل کی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے فتوحات کی روایات، غزوات کے احوال اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کی سیرت کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل مناسب نہیں کہ جب وہ ایسی روایات بیان کریں جو ہمیں بھلی لگتی ہوں تو ہم ان کی تصدیق کر دیں، اور جب وہ ایسی باتیں

روایت کریں جو ہمیں پسند نہ ہوں تو ہم انہیں جھٹلا دیں۔ اور یہ بھی کسی طرح درست نہیں کہ ہم تاریخ کے ایک حصے کو سچا مانیں اور دوسرے حصے کو جھوٹا قرار دے دیں، صرف اس بنیاد پر کہ اس کا کچھ حصہ ہمیں خوش کرتا ہے اور کچھ حصہ ہمیں تکلیف پہنچاتا ہے۔'' مگر خود ڈاکٹر طہ حسین نے — جو اس کلام کے قائل ہیں — بالکل یہی کام کیا؛ چنانچہ جب راویوں نے وہ باتیں بیان کیں جو انہیں ناپسند تھیں اور جو انہیں تکلیف پہنچاتی تھیں تو انہوں نے ان راویوں کو جھٹلا دیا، اور اسی طرح جب انہوں نے وہ باتیں روایت کیں جو انہیں بھلی لگتی تھیں اور جو انہیں خوش کرتی تھیں تو انہوں نے ان کی تصدیق کر دی۔ کیونکہ جن لوگوں نے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی روایات نقل کی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے یہودی عبداللہ بن سبا کے احوال اور وفدِ مصر کے قتل کا حکم دینے والے خط کی روایات بھی نقل کی ہیں؛ تو پھر انہوں نے روایت کے ایک حصے کو بغیر کسی برہان کے کیوں لے لیا، اور اسی کے دوسرے ساتھی حصے کی بغیر کسی دلیل کے نفی کیوں کر دی؟ واضح حقیقت یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے — جیسا کہ انہوں نے خود صفحہ ۱۳۴ پر کہا ہے — یہ چاہا کہ وہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کو اس بات سے بالاتر اور بلند تر ثابت کریں کہ وہ ''اس بات سے کہ ان کے دین، ان کی سیاست، ان کی عقلوں اور ان کی

سلطنت کے ساتھ ایسا شخص کھلواڑ کرے جو صنعاء سے آیا تھا، جس کا باپ یہودی اور ماں سیاہ فام تھی، اور وہ خود بھی یہودی تھا پھر اس نے نہ تو کسی رغبت کی وجہ سے اسلام قبول کیا اور نہ ہی کسی خوف سے، بلکہ محض مکر، عیاری اور فریب کاری کے طور پر (مسلمان ہوا تھا)۔" یہ ایک نیک مقصد اور خوبصورت نیت ہے، لیکن حق ان دونوں سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوبصورت ہے۔ اور نہ تو ہمارے لیے یہ مناسب ہے اور نہ ہی ڈاکٹر طہٰ حسین کے لیے یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کی خاطر حق کے معاملے میں مغالطہ دہی سے کام لیں جسے وہ یا ہم اچھا اور خوبصورت سمجھتے ہیں۔ تاریخ محض من مانی اور زبردستی کے فیصلوں سے نہیں لکھی جاتی، بلکہ تاریخ تو روایات سے، پھر دلیل سے، اور پھر خلاء کو پُر کرنے کے لیے انتھک محنت و کوشش سے لکھی جاتی ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ماضی سے ایسے اسباب، علل اور اہم واقعات اخذ کریں کہ اگر وہ اس حالت تک سیدھے مربوط ہو سکیں جس کی آپ تاریخ لکھ رہے ہیں، تو وہ اس بات کے اہل ٹھہرتے ہیں کہ انہیں تاریخ کا ایسا حصہ مانا جائے جس کا کل یا بعض حصہ حق کے قریب ترین ہو۔

میں ڈاکٹر طہٰ حسین کو کچھ سکھانا تو پسند نہیں کرتا، لیکن میں ان کے سامنے ایسے حقائق ضرور رکھوں گا جن میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں، پھر میں

ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ان میں غور فرمائیں اور خود میرے اور اپنے درمیان فیصلہ کریں۔ اور میں اپنی بات کو انتہائی مختصر رکھوں گا، کیونکہ اس گفتگو کا بیشتر مواد ایسا ہے جس کے بارے میں، میرا یہ گمان نہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس سے ناواقف ہوں گے یا انہوں نے اس سے غفلت برتی ہو گی۔

تو آیئے اب ہم اس قدیم واقعے کی طرف لوٹتے ہیں جو بعثتِ نبوی سے کچھ ہی عرصہ قبل پیش آیا تھا، اور جو عرب کی تاریخ میں انتہائی سنگین نوعیت کا تھا، اور قریب تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کی تاریخ میں ایک بڑے حادثے پر منتج ہو۔ اس پاکیزہ شہر میں قبیلہ اَزد بن غوث کی دو ایسی شاخیں بستی تھیں جن کی ماں اور باپ ایک ہی تھے؛ ان کی ماں قیلہ اور باپ حارثہ بن ثعلبہ تھے، اور یہی لوگ اوس اور خزرج ہیں۔ ان کے درمیان یہودیوں کی وہ نسل بھی آباد تھی جو جزیرۂ عرب یا مدینہ میں سکونت پذیر تھی؛ چنانچہ ان کے حالات میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی کوئی مثال بنو ہاشم اور بنو امیہ کے باہمی تعلقات میں بھی نہیں ملتی، وہ ان دو قبیلوں کے درمیان ایک طویل اور مسلسل جنگ تھی جنہیں ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ نے جنا تھا، اور جو اکٹھے ایک ہی شہر میں رہا کرتے تھے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان یہ لڑائی برابر اپنے شعلے بھڑکاتی رہی یہاں تک کہ ''یومِ بُعاث'' کا معرکہ پیش آیا، اور جیسا

کہ ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات الکبریٰ جلد ۳، حصہ ۲، صفحہ ۱۳۵ پر لکھا ہے:

"یہ ان جنگوں میں سے آخری معرکہ تھا جو اوس اور خزرج کے درمیان لڑی گئیں۔۔۔اور یہ معرکہ اس وقت ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں نبوت کا اعلان فرما چکے تھے اور اسلام کی دعوت دے رہے تھے، پھر اس واقعے کے چھ سال بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔"

ان دو سگے بھائیوں یعنی اوس اور خزرج کے درمیان اس عجیب و غریب عداوت کا پیدا ہونا، ان کا زمانوں تک اس طرح تلخ اور شدید ترین خوں ریزی کرنا، اور اس معاملے میں یہودیوں کا حلیف بن کر شامل ہونا — جس میں سے کچھ اوس کے ساتھ ہو گئے اور کچھ خزرج کے ساتھ جبکہ اس باہمی قتال کی تکلیف دہ لپیٹ میں ان یہودیوں کا خود اپنا بہت کم نقصان ہوتا تھا — اور پھر معاملہ سنگین ہونے پر ان کا یہودیت کے نام پر یکجا ہو جانا تاکہ وہ ان عربوں کے خلاف ایک جان ہو سکیں؛ اس سب کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا کہ یہی یہودی تھے جنہوں نے ان دونوں کے درمیان جنگ اور دشمنی کی آگ بھڑکائی تھی، تاکہ وہ اس سرزمین پر ایسے مال و دولت، گڑھیاں اور قلعے مستحکم کر سکیں جو ان کے لیے سامانِ حرب اور قوت کا باعث بنیں، اور وہ ان عربوں پر غالب آ سکیں جو اس ملک کے اصل مالک تھے؛ نیز وہ ان لوگوں کی توجہ

زراعت، تجارت اور مال کی افزائش سے ہٹادیں اور خود یہودی ہی زراعت، تجارت اور سود و حرام خوری کے ذریعے مال بڑھانے کے تنہا مالک بنے رہیں[1]۔ اور یہودیوں کا یہی شیوہ ہر دور، ہر امت اور ہر زمانے میں رہا ہے اور آج کے دن تک یہی چلا آرہا ہے۔

پھر کچھ ہی عرصہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات عقبہ کے مقام پر خزرج کے ایک گروہ سے ہوتی ہے، اور جیسا کہ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ یہودی ان کے شہروں میں ان پر غالب آچکے تھے، یعنی انہیں مغلوب کر کے وہاں کے تمام وسائل پر خود قابض ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپ سے عرض کیا: ''ہم اپنی قوم کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ کسی بھی دوسری قوم کے درمیان اتنی عداوت اور شر نہیں ہے جتنا ان کے باہم درمیان ہے؛ پس قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ان سب کو یکجا فرمادے گا۔ اب ہم ان کے پاس واپس جائیں گے، انہیں آپ کے اس دعوت کی طرف بلائیں گے اور ان کے سامنے یہ دین پیش کریں گے جسے ہم نے قبول کر لیا ہے؛ پس اگر اللہ

---

[1] اَلسُّحت: ہر وہ حرام اور خبیث چیز ہے، اور کمائی کے وہ پاکیزہ اور ناجائز ذرائع ہیں جو اپنے پیچھے ننگ و عار اور بدنامی چھوڑ جائیں۔

نے ان سب کو آپ پر متحد کر دیا، تو پھر دنیا میں آپ سے زیادہ باعزت کوئی شخص نہ ہو گا۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی برکت سے اوس اور خزرج — جو کہ سگے بھائی تھے — کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا،اور ان میں اسلام نہایت واشگاف انداز میں پھیل گیا۔ اور پھر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، تو اوس اور خزرج کا کوئی بھی محلہ ایسا باقی نہ رہا جس میں اسلام داخل نہ ہوا ہو اور اس کا غلبہ و ظہور نہ ہوا ہو، چنانچہ ایک دن یہودیوں کے قبیلے بنو قینقاع کا ایک بوڑھا شاس بن قیس — جو کفر میں بہت پکا، مسلمانوں کے خلاف سخت بغض و عناد رکھنے والا اور ان سے شدید حسد کرنے والا تھا — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے اوس اور خزرج کے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا۔ جب اس نے اسلام کی بدولت ان کی باہمی الفت، محبت اور صلح و صفائی کو دیکھا — جبکہ جاہلیت میں ان کے درمیان شدید عداوت تھی — تو یہ دیکھ کر وہ اندر ہی اندر جل بھن گیا اور غیظ و غضب میں آ کر کہنے لگا: ''اس سرزمین پر بنو قیلہ (یعنی اوس اور خزرج) کے تمام سردار اور عمائدین اکٹھے ہو گئے ہیں! خدا کی قسم، اگر ان کے اکابرین اسی طرح یہاں متحد رہے تو ہمارا یہاں اب کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔'' چنانچہ وہ یہودیوں کے ایک نوجوان کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کے پاس جا کر

بیٹھ جائے، اور انہیں ”یومِ بُعاث“ اور اس سے پہلے کے معرکوں کی یاد دلائے، اور انہیں وہ اشعار سنائے جو وہ (ایک دوسرے کی ہجو اور ملامت میں) کہا کرتے تھے۔ اس یہودی نے ایسا ہی کیا؛ پس اچانک وہ جماعت جو اسلام پر متحد ہو چکی تھی، آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر فخر و برتری جتانے لگی۔ اسی اثنا میں اوس اور خزرج کے دو آدمی اچھل کر کھڑے ہو گئے، اور ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: ”اگر تم لوگ چاہو تو ہم اس جنگ کی چنگاری کو اب بھی دوبارہ بھڑکا سکتے ہیں“[1]۔ اس پر دونوں فریق سخت طیش میں آ گئے اور کہنے لگے: ”ہاں، ہم تیار ہیں، تمہارا مقابلہ ظاہرہ (ایک مخصوص جگہ کا نام) پر ہوگا“ اور وہ ایک دوسرے کو پکارنے لگے: ”ہتھیار سنبھالو! ہتھیار سنبھالو!“ وہ اپنے مقررہ وقت پر (میدانِ جنگ کی طرف) نکل پڑے، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعے کی خبر پہنچی تو آپ اپنے مہاجر صحابہ کے ہمراہ ان کی طرف روانہ ہوئے؛ یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے تو فرمایا: ”اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو! کیا تم جاہلیت کی پکار پکار رہے ہو جبکہ میں تمہارے درمیان موجود

---

[1] جَذَعَة: یعنی وہ جنگ اپنی اسی اصلی حالت میں لوٹ آئے جیسے وہ شروع ہوئی تھی (مراد یہ ہے کہ ہم جنگ کی اس چنگاری کو نئے سرے سے بھڑکا کر بالکل تر و تازہ کر دیں)۔

ہوں؟اور وہ بھی اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں اسلام کی ہدایت دی، اس کے ذریعے تمہیں عزت بخشی، تم سے جاہلیت کے معاملے کو کاٹ دیا، تمہیں کفر سے نجات دلائی اور اس کے ذریعے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی؟'' پس انصار — چاہے وہ اوس کے ہوں یا خزرج کے — فوری طور پر سمجھ گئے کہ یہ شیطان کا ایک جھٹکا[1] اور ان کے دشمن کی ایک چال تھی۔ چنانچہ وہ رونے لگے اور ایک دوسرے کے گلے مل گئے، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سمع وطاعت کا پیکر بن کر لوٹ آئے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے اللہ کے دشمن، شاس بن قیس یہودی کی عیاری اور مکر کی آگ کو بجھا دیا۔ (بحوالہ ابن اسحاق وغیرہ)۔

میں آپ کے سامنے یہ واقعہ محض اس لیے بیان نہیں کر رہا مگر اس لیے تاکہ آپ اس بات سے واقف ہو سکیں کہ یہودیوں کی عیاری اور مکر و فریب کیسا تھا؟ اور آپ جان سکیں کہ وہ قدیم زمانے ہی سے ان دو قبیلوں کے درمیان

---

[1] نسخوں میں یہ لفظ عین مہملہ (یعنی بغیر نقطے کی عینی ع) کے ساتھ ''نزعة'' لکھا ہوا ہے، جبکہ درست لفظ عین معجمہ (یعنی نقطے والی غین غ) کے ساتھ ''نزغة'' (نزغہ) ہے۔ کسی کے درمیان ''نزغَ بينهم بنزغٍ'' کا مطلب ہے: اکسانا، اشتعال دلانا اور فساد برپا کرنا۔ اور قرآنِ حکیم کی محکم آیت میں ہے: {وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ} ''اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ (یا اکسانا) لاحق ہو، تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔''

عداوت کی آگ بھڑکانے کے لیے کتنے لطیف اور مکارانہ حربے استعمال کرتے تھے؟ اور آپ اس بات پر غور فرمائیں کہ وہ کیوں یہ پسند کرتے تھے کہ یہ دشمنی ہمیشہ زندہ اور شعلہ زن رہے، تاکہ وہ اس کے ثمرات سے مال و دولت، غلبہ اور عربوں پر تسلط کی شکل میں فائدہ اٹھاتے رہیں؟ اور آخری بات یہ تاکہ آپ اس سارے منظر نامے کا موازنہ اس صورتِ حال سے کر سکیں جو آج کے دن تک بنی اسرائیل کے اس خبیث ٹولے کے ہاتھوں مسلسل چلی آرہی ہے!

پھر اللہ جل شانہٗ اس فتنے کے باب میں یہ آیات نازل فرماتا ہے، جس میں وہ ان مسلمانوں سے مخاطب ہے جن کے درمیان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اور ابھی آپ کی وفات نہیں ہوئی تھی:

{يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ(١٠٠)وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ}

"اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کی بات مانو گے، تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنادیں گے۔ اور تم کیسے کفر کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کے

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہیں؟ اور جو کوئی اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لے، تو یقیناً اسے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کر دی گئی۔"

لہٰذا، اب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب — خواہ وہ اوس سے ہوں یا خزرج سے — کو اس بات سے بالاتر نہیں سمجھ سکتے کہ انہوں نے یہودیوں کے ایک گروہ کی بات مانی، یہاں تک کہ وہ قریب تھے کہ انہیں ان کے ایمان کے بعد دوبارہ کافر بنا دیتے؛ اور نہ ہی ہم انہیں اس معاملے سے بالکل منزہ و پاک قرار دے سکتے ہیں، جبکہ حال یہ تھا کہ ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جا رہی تھیں اور ان کے درمیان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے! جیسا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس وقت کرنے کی کوشش کی جب انہوں نے ۳۵ ہجری میں صدرِ اول کے مسلمانوں کو ہر قسم کی لغزش سے پاک ثابت کرنا چاہا؛ حالانکہ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات دیے بیس سال سے زائد کا عرصہ گزار چکا تھا، اور نوجوانوں کی ایک ایسی نئی نسل پروان چڑھ چکی تھی جس کے بارے میں کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ سب کے سب اپنے ایمان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کے ابتدائی انصار سے زیادہ حریص تھے۔ یہ تو محض ایک ہی واقعہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے، اب اگر آپ چاہیں کہ میں ایسے تمام واقعات روایت

کروں، تو میرے پاس کوئی ایسی کتاب ہی نہ بچے گی جس میں ان فتنوں کی تفصیل سما سکے جو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھڑکائے تھے،اور نہ ہی میرے لیے ممکن ہے کہ میں اللہ کی کتاب کی ان تمام آیات کا احاطہ کر سکوں جو ان فتنوں کے احوال میں نازل ہوئیں۔اور بھولے ہوئے کو یاد دلانے کے لیے میرا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ منافقین کے احوال اور ان کے بارے میں نازل ہونے والی تمام آیات مدینہ منورہ ہی میں نازل ہوئیں، مکہ مکرمہ میں نہیں؛ اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نفاق وہیں پروان چڑھا جہاں یہودی موجود تھے، اور یہ کہ "اعراب"(بدوؤں) کا ذکر بھی صرف مدنی سورتوں ہی میں نفاق اور منافقین کے ساتھ ملا کر کیا گیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا سورۂ براءت (توبہ) میں یہ فرمانا کہ:

{الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا}

"یہ اعراب (بدو) کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں"

یہ آیت بنو اسد اور غطفان کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اور یہ لوگ جاہلیت کے زمانے میں بھی اور اسلام کے دور میں بھی یہودیوں کے حلیف رہے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں، میں امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر طہ حسین اسے ذہن نشین رکھیں گے تاکہ جب ہم آگے چل کر اس

موضوع کی طرف لوٹیں تو یہ ان کے پیشِ نظر ہو۔ یہ تمام تر مکر، عیاری اور ریشہ دوانیاں کوئی ایسا کام نہیں تھا جو یہودیوں کی طرف سے یوں ہی اچانک اور بلا قصد و ارادہ صادر ہو گیا ہو، اور نہ ہی اس کا سبب کوئی ایسی بد سلوکی تھی جو انہیں ان کے حلیفوں یعنی اوس اور خزرج کے انصار، جو منافق نہیں بلکہ سچے مؤمن تھے — کی طرف سے پہنچی ہو؛ بلکہ یہ تو وہ شر (اور خباثت) تھی جو یہودیوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، جو ان سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی خواہ مسلمان ان کے ساتھ کتنا ہی حسنِ سلوک کیوں نہ کریں؛ اور یہ اس دین کے پیروکاروں کے خلاف ایک (دیرینہ) بغض، کینہ، کفر اور سرکشی تھی، اور یہ لوگ ویسے ہی ہیں جیسا کہ اللہ نے ان کا وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ محمد صلوات اللہ علیہ پر ایمان لانے والوں کے سب سے شدید دشمن ہیں۔ اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ بہت سے ایسے مرد تھے وہ اپنے معاملات میں ان (یہودیوں) سے نصح و خیر خواہی کا مشورہ مانگتے تھے، بغیر اس کے کہ وہ ان پر کوئی شک کریں یا اپنے دلوں میں ان کی طرف سے کسی خوف و خطرے کو جگہ دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائیں:

{يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَاعَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (١١٨)هَاأَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ} ''اے ایمان والو! اپنے سوا (کسی غیر کو) اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی اور نقصان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، وہ تو اس چیز کے خواہاں ہیں جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔ یقیناً ان کے منہ سے تو بغض و عناد ظاہر ہو ہی چکا ہے، اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لیے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔ دیکھو! یہ تم ہی ہو جو ان سے محبت رکھتے ہو جبکہ وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، اور تم تو تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''ہم ایمان لے آئے''، اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے مارے انگلیاں چبا چبا ڈالتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ تم اپنے اسی غصے میں مر جاؤ! یقیناً اللہ سینوں کے بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔'' اور یہ وہ لوگ

ہیں ”جنہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے“ جن کے بارے میں سورۂ آلِ عمران ہی میں اس آیت سے پہلے یہ آیت نازل ہو چکی تھی:

{وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ}

”اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے (آپس میں) کہا کہ جو کچھ ایمان والوں پر نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے آغاز میں ایمان لے آیا کرو اور دن کے آخر میں اس کا انکار کر دیا کرو، تاکہ وہ (اپنے دین سے) پھر جائیں۔“

یہ آیت اور اس کا سببِ نزول اس بات پر بالکل صریح اور واضح دلالت کرتا ہے کہ ابتدائی دور کے مسلمان، یہودیوں اور اپنے درمیان قائم حلیفانہ تعلق (معاہدے) کو اب بھی ایک سچا اور مخلصانہ عہد ہی سمجھتے تھے جس میں کوئی کھوٹ یا غداری نہیں تھی؛ جبکہ یہودی ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کے خلاف شدید ترین عداوت اور بدترین غیظ و غضب دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ اس دشمنی کو آپس میں انتہائی رازداری سے چھپا کر رکھتے تھے، اور ان مؤمنین کو اس طرح دھوکا دیتے تھے کہ ان کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے اور کفر کو اندر ہی اندر چھپائے رکھتے، یہاں تک کہ جب کچھ مؤمنین ان کی باتوں کا یقین کر لیتے تو وہ دوبارہ کفر کا اظہار

کرنے لگتے تاکہ انہیں آزمائش میں ڈالیں اوران کے دین کے معاملے میں انہیں دھوکادے سکیں۔ پس اگر یہ بات درست ہے — اور یہ یقیناًدرست ہے — جبکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے، تو ۳۵ ہجری میں (اس قسم کے دھوکے کا ہو جانا) سچائی کے اور بھی زیادہ قریب ہو جاتا ہے؛ (اس لیے) ہم صدرِاول کے مسلمانوں کواس بات سے بالاتر نہیں سمجھ سکتے کہ وہ اس جیسے یا اس سے بھی کہیں زیادہ شدید فتنے اور لغزش کا شکار ہو سکتے تھے۔

ڈاکٹر طہ حسین، اور ہر وہ شخص جو پڑھنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ ہجرت کے وقت سے لے کر اس دن تک کی سیرت اور مغازی کی کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے جس دن ان کے رب نے انہیں رفیقِ اعلیٰ کی طرف بلا لیا؛ تو وہ یہ پائے گا کہ ابھی معرکۂ بدرِ کبریٰ اللہ کے لشکر کی عظیم الشان فتح کے ساتھ ختم بھی نہیں ہوتا کہ نفاق کا سرغنہ عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کا منافقین کا ٹولہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیتا ہے، اور یہ لوگ یہودیوں کے مددگار تھے۔ بس اسی دن سے نفاق کا یہ لاوا پھٹ پڑتا ہے اور اس کا خطرہ وبائی شکل اختیار کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے بارے میں بکثرت آیات نازل ہوتی ہیں، اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دلوں کے بھیدوں اور ان کے مکر وفریب پر، بلکہ خود ان کی

ذات اور چہروں تک پر مطلع فرما دیتا ہے۔اسی دن سے بعض یہودیوں نے اس عہد وپیمان کو علانیہ توڑنا شروع کر دیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے وقت اپنے اور ان کے درمیان تحریر فرمایا تھا؛ چنانچہ اسی پاداش میں یہودی ابو عفک کا قتل ہوا، پھر یہودیوں کے قبیلے بنو قینقاع کا غزوہ پیش آیا، اور پھر ابو سفیان بن حرب کا یہودیوں کے قبیلے بنو نضیر سے مدد مانگنا شروع ہوا جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخبریاں اور خبریں اس تک پہنچاتے تھے۔ پھر غزوۂ احد کے دن وہ واقعہ پیش آیا کہ منافق عبداللہ بن ابی بن سلول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلا، لیکن جیسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد کے مقام پر پہنچے، ابنِ ابی اپنے پیروکاروں کے لشکر کو لے کر یہ کہتا ہوا الگ ہو گیا: ''اس نے میری نافرمانی کی اور بچوں (کم عمر لڑکوں) کی بات مان لی؟'' پھر مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور جب وہ مدینہ واپس لوٹے تو عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے منافق ساتھیوں نے ان پر شماتت کا اظہار کیا ان کا مذاق اڑایا، اور یہودیوں نے بھی نازیبا باتیں کہنا شروع کر دیں؛ وہ کہتے: ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بس بادشاہت کے طالب ہیں! کسی نبی کو کبھی ایسی چوٹ نہیں پہنچی جیسی انہیں پہنچی ہے کہ وہ خود بھی زخمی ہوئے اور ان کے صحابہ بھی مارے گئے!'' پھر ابھی پانچ مہینے بھی نہ

گزرے تھے کہ بنو نضیر کے یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دھوکے سے قتل کرنے کی کوشش کی جب آپ ان کے گھروں کے پاس تشریف لے گئے؛ انہوں نے آپس میں سازش کی کہ جس مکان کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں، اس کے اوپر سے آپ پر ایک بھاری پتھر گرادیا جائے، لیکن آپ کے پاس وحی آگئی جس نے آپ کو ان کے اس ناپاک ارادے سے مطلع کر دیا۔ پھر کچھ مہینوں بعد یہودی ابو رافع سلام بن ابی الحقیق ''غطفان'' اور ان کے ارد گرد کے مشرک عربوں کے پاس گیا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ لڑنے پر اکسانے لگا۔ پھر۔۔۔

آپ مسلسل ایک واقعے سے دوسرے واقعے، ایک غداری سے دوسری غداری، اور ایک نفاق سے دوسرے نفاق کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے، جبکہ یہودی ہی ان تمام معاملات کے سرغنہ، اس کے تانے بانے بننے والے اور اس میں گہرے دھنسے ہوئے نظر آئیں گے؛ یہاں تک کہ بات اس یہودی عورت کے واقعے پر جا کر ختم ہوتی ہے جس نے بکری کے گوشت میں زہر ملایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تھی جبکہ آپ خیبر میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بکری کا گوشت تناول فرمایا، پھر

آپ کو وحی کے ذریعے بتادیا گیا کہ یہ زہر آلود ہے تو آپ نے اسے منہ سے نکال دیا۔

پس اس سب کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ظاہر ہوا، یہودیوں کی نہ تو زبان فتنہ انگیزی سے رکی، نہ ان کے ہاتھ تھمے، اور نہ ہی ان کا کھوٹ، غداری، مکر و فریب اور بغض کبھی کم ہوا؛ اور یہ کینہ پروری کسی ایسی بدسلوکی کا نتیجہ نہیں تھی جو ایمان لانے والوں کی طرف سے انہیں پہنچی ہو، بلکہ یہ تو محض ایک موروثی یہودی عصبیت تھی اور ایک ایسی جبلت تھی جو انسانوں کی اس نسل کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ نیز، نفاق بھی ان کی سازشوں کا ایک حصہ اور اس دین کے پیروکاروں کے خلاف ان کے سینوں میں ابلتے ہوئے کینے کے اخراج کا ایک راستہ تھا؛ اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کا بالکل حق پر مبنی وصف بیان فرمایا ہے، چنانچہ وہ اپنی پاک ذات میں فرماتا ہے:

{لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (٧٨) كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (٧٩) تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ (٨٠) وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ

إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (٨١) لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَى ذَلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ}

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی؛ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جایا کرتے تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو کسی ایسے برے کام سے نہیں روکتے تھے جو وہ کرتے تھے؛ یقیناً بہت ہی برا تھا جو کچھ وہ کر رہے تھے۔ آپ ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستی گانٹھتے ہیں؛ یقیناً بہت ہی برا ہے وہ سامان جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا ہے کہ اللہ ان پر غضب ناک ہوا، اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔ اور اگر وہ اللہ پر، نبی پر اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا اس پر سچا ایمان رکھتے، تو کبھی ان (کافروں) کو اپنا سرپرست و مددگار نہ بناتے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ آپ ایمان لانے والوں کا سب سے شدید دشمن یہودیوں اور ان لوگوں کو پائیں گے جنہوں نے شرک کیا؛ اور ایمان لانے والوں کے لیے محبت میں سب سے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے

جنہوں نے کہا کہ 'ہم نصاریٰ ہیں'۔ یہ اس لیے کہ ان میں عبادت گزار علماءاور مشائخ (درویش) ہیں،اوراس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔''

یہودیوں کا یہ وصف جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، نہ کبھی ختم ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ختم ہو گا، جب تک کہ اس زمین پر ایک بھی ایسا مسلمان باقی ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔اور آپ اگلی تحریر میں دیکھیں گے کہ کس طرح یہودی مسلمانوں کے بہت سے معاملات کو بگاڑنے میں کامیاب رہے، اور انہوں نے ایک ایسا فتنہ کھڑا کیا جو قریب تھا کہ پورے اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ نے اپنے بندوں سے وعدہ فرما رکھا ہے کہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر کے رہے گا، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی نا گوار گزرے۔

❸ الفتنة الكبریٰ (فتنۂ اکبر)

جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ بات بالکل واضح تھی کہ حجاز کے یہودیوں نے جاہلیت کے دور میں ایک ہی ماں جائے اور ایک ہی باپ کی اولاد کے درمیان عداوت کی آگ بھڑکائی تھی جو ایک ہی شہر میں بستی تھی، اور وہ (قبیلے) اوس اور خزرج تھے۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ جاہلیت کے ایک طویل عرصے تک کھنچتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ ''یومِ بُعاث'' کے موقع پر ایک دوسرے کو بالکل فنا کر دینے کے قریب پہنچ گئے تھے، اور یہ معرکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ ہجرت سے چھ سال قبل پیش آیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان جو کچھ خون خرابہ ہوا، وہ اوس اور خزرج کے بعض عقل مند لوگوں پر انتہائی گراں اور سخت گزرا تھا، کیونکہ ان کی حالت ویسی ہی ہو چکی تھی جیسی انصار کے اصحابِ بیعتِ عقبہ اولیٰ نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود بیان کی تھی جب انہوں نے عرض کیا تھا: ''ہم اپنی قوم کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ (آپس کی) عداوت اور شر کا جو عالم ان کے درمیان ہے، وہ کسی اور قوم میں نہیں ہے''۔ اور اس دور میں یہودی ''ان کے شہروں میں ان پر غالب آ چکے تھے''یعنی انہوں نے ان پر غلبہ پا لیا تھا اور وہاں کے وسائل پر تنہا قابض ہو بیٹھے تھے، جیسا کہ صحابہ کرام

کے بعض مردوں اور قدیم تاریخ کے اکثر راویوں نے بیان کیا ہے۔ یہودیوں کا کوئی گروہ اوس کا حلیف اتحادی بنا ہوا تھا تو کوئی خزرج کا، لیکن جب کوئی کڑا وقت آتا تو وہ سب مسلمانوں کے خلاف ایک جان ہو جاتے تھے۔ چنانچہ وہ ان دونوں بھائیوں کی جنگوں سے اس طرح صاف نکل جاتے کہ انہیں کوئی چھوٹا یا بڑا نقصان نہ پہنچتا، بلکہ وہ اوس اور خزرج سے کہا کرتے تھے: ''یقیناً اب ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں جن کا زمانہ قریب آ پہنچا ہے، ہم ان کی پیروی کریں گے اور ان کے ساتھ مل کر تمہیں اس طرح قتل کریں گے جیسے عاد اور اِرم قتل کیے گئے تھے''۔ جنگ و عداوت نے ان دونوں قبیلوں کو ایسا مصروف رکھا کہ وہ زراعت سے غافل ہو گئے اور اس پر یہودی قابض ہو گئے، انہیں تجارت سے بے پروا کر دیا تو اس پر یہودیوں نے اجارہ داری قائم کر لی، اور انہیں اپنی زمین کی حفاظت سے غافل کر دیا تو یہودیوں نے اس میں خوب فساد مچایا۔ اور یہودیوں نے مدینہ منورہ اور اس کے ارد گرد بہت سے الگ الگ قلعے اور گڑھیاں بنانا شروع کر دیں، اور ان قلعوں میں جہاں تک ہو سکا اسلحہ، زرہیں اور جنگی ساز و سامان جمع کرنے لگے [1]۔ جنگی ساز و سامان اکٹھا کرنے لگے۔ اور یہ ساز

---

[1] الحَلْقَة سے مراد لوگوں کی جماعت ہے، یعنی مقصود یہ ہے کہ وہ جنگ کے لیے مردوں (افرادی قوت) کو تیار کرتے تھے؛ یا پھر اس لفظ سے ان کی مراد مطلقاً اسلحہ (یا زرہیں) تھی۔

وسامان اس قدر کثیر مقدار میں تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ — مہاجرین وانصار — کے ہاتھوں یہ قلعے اور گڑھیاں فتح ہوئیں، تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔یہودیوں کا یہ طرزِ عمل صرف مدینہ منورہ اور اس کے نواح تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ بالکل ایسا ہی حال جزیرۃ العرب کے جنوب میں بھی تھا؛ یعنی یمن میں، اور نجران و صنعاء کے ان علاقوں میں جو بحرین کی سمت واقع تھے۔وہ ان تمام علاقوں میں قلعے اور گڑھیاں تعمیر کرتے تھے اور ان میں بھاری مقدار میں اسلحہ جمع کر کے اپنے ذخائر کو وسعت دیتے تھے۔انہوں نے ان تمام اطراف میں اپنے لیے ایسے شہر یانیم شہر (مستقل بستیاں) بسا لیے تھے جو خالصتاً انہی کے لیے مخصوص تھے اور ان میں ان کے ساتھ کوئی دوسرا سکونت پذیر نہیں ہوتا تھا۔

جی ہاں، وہ شہر، قلعے اور گڑھیاں تعمیر کرتے، سلاح جمع کرتے، اور اپنے پڑوس میں رہنے والے دیہاتیوں اور بدوؤں سے حلیفانہ معاہدے کرتے تھے، اور پھر اپنے ہی ان حلیفوں کے درمیان دشمنی اور شر کی آگ بھڑکا دیتے تھے — مدینہ منورہ میں بھی اور جزیرۃ العرب کے دیگر مقامات پر بھی۔آخر یہودی عمارتوں اور اسلحے کی اس قدر تیاری، بغض و عناد کی آگ سلگانے، اور لوگوں کا رخ زندگی کے پُر امن وسائل سے موڑ کر جنگ کے میدانِ کارزار کی طرف

پھیرنے سے کیا چاہتے تھے ؟ وہ مثال کے طور پر مدینہ میں یہ چاہتے تھے کہ یہ شہر اور زمین خالصتاً ان کے قبضے میں آ جائے، جب اوس اور خزرج ان جنگوں میں ایک دوسرے کو بالکل فنا کر چکیں جن کی آگ یہ یہودی ان کے درمیان مسلسل دہکائے رکھتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے ان کے اس طرزِ عمل کو اس وقت بھی دیکھا جب ایک یہودی شاس بن قیس نے اسلام کی برکت سے اوس اور خزرج کے مابین باہمی صلح، الفت اور صفائیِ قلب کا وہ منظر دیکھا جو اسے ایک آنکھ نہ بھایا؛ چنانچہ اس نے یہودیوں کے ایک نوجوان کو ان کی طرف بھیجا جو انہیں وہ اشعار یاد دلائے جو وہ اپنی باہمی جنگوں کے دوران ایک دوسرے کے خلاف کہا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان پرانی باتوں کی یاد تازہ ہوتے ہی مسلم اوس اور مسلم خزرج کے درمیان دوبارہ جنگ چھڑنے ہی والی تھی، اگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بروقت ان کے پاس تشریف نہ لاتے اور انہیں دوبارہ ان کی عقلوں کی طرف نہ لوٹاتے، اور اس یہودی شاس بن قیس کی سازش کو ٹھنڈا نہ فرماتے۔ جس کسی نے بھی ماضی میں یہودیوں کے اس طرزِ عمل کا موازنہ دورِ حاضر میں فلسطین کے اندر ان کے افعال سے کیا — یعنی ان کا مدینہ اور جزیرے کے دیگر حصوں میں قلعے، گڑھیاں اور بستیاں تعمیر کرنا، اور موجودہ دور میں فلسطین کے اندر ان کا مستقل شہر، فوجی چھاؤنیاں اور صہیونی

بستیّاں قائم کرنا — تو وہ جان لے گا کہ یہ یہودیوں کی قدیم ترین خصلت ہے، اور ماضی و حال میں ان کا یہ طریقہ کار بالکل ایک جیسا ہے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے (یعنی بال برابر بھی فرق نہیں ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی اس وقت بھی شمال میں مدینہ کے اندر اور جنوب میں یمن کے اندر ایک ریاست قائم کرنا چاہتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے وہ آج فلسطین میں اور فلسطین کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی یہودیوں کی ایک ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

جاہلیت میں ان کا معاملہ یہی تھا: پھر اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرماتا ہے اور آپ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرماتے ہیں، تو آپ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی اس دن سے اسلام کی تاریخ یہودیوں کی خبروں، ان کے فتنوں، اور مشرک عربوں اور مؤمن عربوں کے درمیان عداوت کی آگ بھڑکانے کے واقعات سے بھر جاتی ہے۔ نیز اس تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مختلف قبائل کو ابھارنے اور اکٹھا کرنے کی ان کی کوششیں، اور ان کی غداریاں، عہد شکنیاں اور ریشہ دوانیاں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ انہوں نے ایک گھڑی کے لیے بھی مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی غفلت یا کسی کمزور پہلو کی ٹوہ لینا بند نہیں کیا، اور نہ ہی خود مؤمنوں کے درمیان

پھوٹ ڈالنے کی جستجو سے باز آئے۔ اور اسی دن سے اسلام کی تاریخ منافقین کی خبروں سے بھی بھر جاتی ہے،اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کا وصف ہمارے سامنے نہایت عمدہ طریقے سے بیان فرمایا ہے، اور ہمارے لیے یہودیوں کے ساتھ ان کے تعلق اور یہودیوں کی طرف سے انہیں پناہ دیے جانے کو بہترین انداز میں واضح کر دیا ہے۔اسی لیے یہودیوں اور منافقین دونوں کے معاملے میں نازل ہونے والی اکثر آیات ایسی ہیں جن میں دونوں کا ذکر ایک ساتھ ملا کر کیا گیا ہے۔ اور قرآنِ مجید کی جو سب سے پہلی سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، وہ وہی سورت ہے جس میں گائے کا ذکر ہے (یعنی سورۂ بقرہ)۔ چنانچہ امام طبری اپنی تفسیر (جلد 1، صفحہ 84) میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یقیناً سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ — اس کی پہلی سو آیات تک — ان اشخاص کے بارے میں نازل ہوا جن کے نام ان کی ذات اور نسب کے ساتھ متعین کر کے بتائے گئے، جو کہ یہودیوں کے علماء (احبار) میں سے تھے اور اوس و خزرج کے منافقین میں سے تھے۔ ہم نے ان کے ناموں کے ذکر سے کتاب کو طول دینا ناپسند کیا۔" پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ پھر مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی آخری سورت، یا یوں کہہ لیں کہ قرآنِ مجید کی آخری نازل ہونے والی سورت، سورۂ

''براءت'' یا سورۂ ''توبہ'' ٹھہرتی ہے۔ یہ وہی سورت ہے جس نے یہودیوں اور منافقین کو رسوا کیا، ان کے دلوں کے بھیدوں کو چاک کیا، اور ان کی ان باتوں اور سازشوں کو بے نقاب کر دیا جو وہ راتوں کو چھپ کر گھڑا کرتے تھے۔

یہ وہی سورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِؤُا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ}

''منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی ایسی سورت نازل نہ کر دی جائے جو ان کے دلوں کی چھپی باتوں کو ان (مؤمنوں) پر ظاہر کر دے۔ آپ کہہ دیجیے کہ: تم تمسخر اڑاتے رہو، یقیناً اللہ اس چیز کو باہر لا کر رہے گا جس سے تم ڈر رہے ہو۔''

یہ وہی سورت ہے جس کا نام بعض (مفسرین و صحابہ) نے ''**الفاضحة**'' (رسوا کرنے والی)، ''**المُخْزِية**'' (ذلیل کرنے والی)، ''**المُنَكِّلَة**'' (عبرت ناک سزا دینے والی)، ''**المُشَرِّدَة**'' (تتر بتر کر دینے والی)، اور ''**المُدَمْدِمة**'' (ہلاک و برباد کرنے والی) رکھا ہے؛ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سورت یہودیوں اور منافقین کے لیے کیسی رسوائی، ذلت، عبرت، دربدری اور تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ پھر یہی وہ سورت ہے جس میں مدینہ منورہ کے گردا گرد بسنے

والے ان ''بدوؤں'' کا — جو یہودیوں کے حلیف تھے — چھ مرتبہ ذکر آیا ہے۔

قرآنِ مجید کی سب سے پہلی سورت مدینہ میں نازل ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہودیوں اور منافقین کے بارے میں ہے، اور قرآن کی آخری سورت نازل ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ بھی یہودیوں، منافقین اور مدینہ کے ارد گرد رہنے والے ان کے حلیف بدوؤں کے بارے میں ہے؛ اور ان دونوں کے درمیان کا پورا قرآن دس سال کے متواتر عرصے میں نازل ہو کر ان لوگوں کے احوال بیان کرتا ہے، انہیں انجامِ بد سے ڈراتا ہے، اور ان کی ریشہ دوانیوں اور مکر و فریب کو بے نقاب کرتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس پورے دورانیے میں — جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، یہاں تک کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات دی — اسلام کی تاریخ غداری، مکر، فتنہ انگیزی، عہد شکنی اور مواثیق کو توڑنے کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس سب کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ یہودیوں کے علماء (احبار) کا ایک گروہ — جن کے نام سیرت اور تاریخ کے مصنفین نے تفصیل سے ذکر کیے ہیں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں منافقانہ طور پر اسلام قبول کرتا ہے (جس طرح بعد میں کعب الاحبار اور عبداللہ بن سبا وغیرہ نے عمر

اور عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں کیا تھا)۔ پس یہ لوگ مسجدِ نبوی میں حاضر ہوتے، مسلمانوں کی باتیں سنتے، اور ان کا مذاق اڑاتے اور ان کے دین کا استہزاء کرتے تھے۔ چنانچہ ابنِ ہشام ان کے بارے میں ہمیں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پس ایک دن منافقینِ یہود میں سے کچھ لوگ مسجدِ نبوی میں اکٹھے ہوئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا کہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے بالکل جڑے بیٹھے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں حکم صادر فرمایا، تو انہیں مسجد سے نہایت سختی کے ساتھ باہر نکال دیا گیا''۔ بھلا سازشیں گھڑنے والوں کے اس طرزِ عمل سے بڑھ کر بھی کوئی واضح اور روشن مثال آپ کو مل سکتی ہے، جب وہ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور دھیمی آوازوں میں ایسی باتیں کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ مکر و فریب کی چالیں چلتے ہیں اور راتوں کو سازشیں تیار کرتے ہیں؟ اور منافقین اور یہودیوں کا باہمی گٹھ جوڑ اور یہی حال مسلسل قائم رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ منافقین یہودیوں کے سرداروں اور شیوخ کے ہاں پناہ لیتے تھے اور دس سال تک مسلسل، دن بہ دن سازشیں گھڑتے رہے۔ ان سازش کاروں کا سرغنہ رفاعہ بن زید بن التابوت یہودی جیسے لوگ تھے، جس

نے ظاہر میں اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور باطن میں نفاق چھپا رکھا تھا۔ مسلمان اسے "منافقین کا غار" (کہف المنافقین) کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ تنہائی میں اس کے پاس جایا کرتے تھے، رات کی تاریکی میں سازشیں تیار کرتے تھے، اور اس سننے اور دیکھنے والے غار کے اندھیرے میں اپنی سازشوں کے راز اور مخفی مکر امانت کے طور پر رکھ چھوڑتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تمام عرصے میں ان سے جہاد فرماتے رہے اور ان کی ہدایت کی امید رکھتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی مایوسی اور ناامیدی کے آٹھ سال تک مسلسل یہی طرزِ عمل اختیار کیے رہے، یہاں تک کہ منافقین میں سے جو مر جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جنازہ بھی پڑھاتے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا بھی فرماتے۔ پھر جب یہ سلسلہ طویل ہو گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے آخری نازل ہونے والی سورت، یعنی سورۂ براءت (التوبہ) میں قرآنِ مجید کی وہ سخت ترین آیت نازل فرمائی جس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندے اور نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا:

{اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ}

”آپ ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں یا نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی مغفرت کی دعا کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

پھر اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی سختی سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

{وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ}

”اور ان میں سے کوئی بھی مر جائے تو آپ کبھی بھی اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھائیں، اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں؛ یقیناً انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔“

یہ ایسے فیصلہ کن کلمات اور حتمی احکام ہیں جو تلوار کی دھار کی طرح کاٹ دار ہیں!

دس سال تک قرآنِ کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منافقین اور یہودیوں کے بارے میں نازل ہوتا رہا، جہاں ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ جڑا رہا! دس سال کی وہ تاریخ ہے کہ جب آپ سیرت کی کتابوں میں اس کا مطالعہ

کرتے ہیں، تو ایک صفحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں یہودیوں اور منافقین کا تذکرہ ایک ساتھ موجود نہ ہو۔ دس سال تک یہودی اور منافقین مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قبائل کو ابھارتے رہے، مسلمانوں کو فتنوں میں مبتلا کرتے رہے، اور مؤمن مردوں، مؤمن عورتوں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مکر وفریب کے جال بنتے رہے؛ یہاں تک کہ انہی سازشوں کے تسلسل میں اس یہودی عورت کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے لیے بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا تھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس کی اس حرکت کی خبر دے دی گئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کا وہ ٹکڑا اپنے دہنِ مبارک سے باہر نکال دیا۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ پھر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام حدیث سناتے ہیں، اور ان میں سے اس امت کے امین، حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہمیں بتاتے ہوئے فرماتے ہیں: ''آخری کلام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا، وہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہودیوں کو حجاز سے نکال دو، اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے جلا وطن کر دو۔'' یہ وہ آخری کلام تھا جو آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے دنیا کے آخری اور آخرت کے اولین لمحے میں ارشاد فرمایا! یہ وہ آخری لفظ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر اس وقت جاری ہوا جب آپ رفیقِ اعلیٰ کے پاس اپنے رب کی پکار پر لبیک کہہ رہے تھے! راوی اس فرمان کو روایت کرتے ہیں، اور ہمارے علماء — اللہ انہیں بہترین جزا عطا فرمائے — آکر اس حدیث پر ٹھہرتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ اس حتمی اور فیصلہ کن حکم کا راز کیا تھا؟ وہ کسی پوشیدہ راز تک نہیں پہنچ پاتے اور نہ ہی انہیں اس کے سوا کوئی اور وجہ ملتی ہے، سوائے اس کے کہ وہ سب بالا تفاق وہی بات کہیں جو ابو عبید قاسم بن سلام نے اپنی کتاب الاموال (صفحہ 99) میں کہی ہے کہ: "ہمارا گمان یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ان کی طرف سے کی جانے والی عہد شکنی، یا صلح کے بعد ان کی پیدا کردہ کسی نئی (سازش یا فتنہ انگیزی) کی وجہ سے فرمائی تھی۔"

اے علمائے کرام! ذرا ٹھہریے، جلدی نہ کیجیے۔ یہ ایک انتہائی کمزور اور بودی تاویل ہے، اور آپ حضرات ظن و گمان کو تاویل کے لیے بنیاد مت بنائیے۔ آپ کے لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ آپ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے: حجاز کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کی طرف سے آخر وہ کون سی عہد شکنی ہوئی تھی؟ اور اس کی خبر کیسے غائب ہو گئی کہ ہم تک اس کی کوئی روایت ہی

نہ پہنچی؟ اور صلح کے بعد انہوں نے ایسا کون سا نیا فتنہ کھڑا کیا تھا؟ اور اس کا احوال ہم سے کیسے پوشیدہ رہ گیا؟ لیکن اللہ آپ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے کسی ایسی رائے پر اصرار کرتے ہوئے اسے حتمی بنا کر پیش نہیں کیا جس سے لوگوں کو دھوکے میں رکھا جاتا — جیسا کہ ہمارے اس دور کے علم کے دعویدار اور جھوٹے علماء کرتے ہیں — بلکہ آپ سب نے وہی کہا جو ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا تھا کہ: "إنّما نُرَاه" (نون پر پیش کے ساتھ)، یعنی "ہم محض ایسا گمان کرتے ہیں"۔ مگر ایسے اہم اور حساس معاملے میں محض گمان کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور آپ ایک ایسی حدیث کی تفسیر ایسے ظن و تخمین سے کیسے کرنا چاہتے ہیں جس کے حق میں نہ کوئی روایت آئی ہو، اور نہ ہی تاریخ کے واقعات میں سے کوئی ایسی خبر معلوم ہو جو اس کی تائید کرتی ہو؟

ہر گز نہیں اے علمائے کرام! یہ وہ آخری کلام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں ارشاد فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے منہ موڑ کر آخرت کی طرف متوجہ ہو رہے تھے؛ یہ اللہ کے اس نبی کی زبان سے نکلنے والا آخری کلمہ ہے جو اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہیں بولتے۔ ہر گز نہیں! یہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ بڑا، عظیم اور سنگین ہے جو تم گمان کر رہے ہو۔ یہ

تو نبوت کے کلمات میں سے ایک کلمہ ہے! یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر آنے والے ان واقعات پر ایک تنبیہ ہے جو مستقبل میں رونما ہونے والے تھے، جن میں انسان صبح کو مؤمن ہو گا اور شام کو کافر۔ یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مستقبل کے غیب کے وہ حالات منکشف ہو رہے تھے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسترِ مرگ پر ہی دیکھ لیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے بعد میں مسلمانوں نے انہیں اپنی آنکھوں سے عیاں دیکھا: یعنی حجاز اور اس کے اطراف میں ایک مٹا دینے والا فتنہ، اور نجران اور اس کے گرد و نواح میں مچنے والی ایک تلاطم خیز ہلچل۔ ایک بھڑکتی ہوئی آگ جو مدینہ کے ارد گرد حجاز میں لگی تھی، اور دوسری دہکتی ہوئی آگ جو نجران کے گرد و نواح یمن میں الاؤ بن رہی تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کسی گزرے ہوئے واقعے کی بنا پر نہیں فرمائی تھی، بلکہ اس حادثے کی وجہ سے فرمائی تھی جو عنقریب رونما ہونے والا تھا، جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو دیکھ رہے تھے لیکن آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کی سختی اس قدر شدید ہو کر نازل ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا، آپ صلی اللہ علیہ

وسلم اس میں اپنا ہاتھ ڈالتے اور پھر اپنے چہرہ مبارک پر پانی ملتے اور فرماتے: ''اے اللہ! موت کی سختیوں پر میری مدد فرما۔ اے اللہ! موت کی بے چینی پر میری مدد فرما۔ اے جبرئیل! میرے قریب ہو جاؤ، اے جبرئیل! میرے قریب ہو جاؤ، اے جبرئیل! میرے قریب ہو جاؤ۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کملی (اونی یا ریشمی دھاری دار چادر) تھی، جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پکڑتے اور اپنے چہرہ مبارک پر ڈال لیتے۔ پھر جب اس کی وجہ سے سانس رکنے لگتی اور گھبراہٹ ہوتی، تو اسے اپنے چہرے سے ہٹا دیتے اور اس حالت میں فرماتے: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو مسجدیں بنالیا۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے: ''اگر میں زندہ رہا تو جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہیں رہنے دوں گا۔'' موت کی اسی بے پناہ تخلیف وکرب کی حالت میں — جس کا منظر آپ دیکھ رہے ہیں — آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلنے والا آخری کلام یہ تھا: ''یہودیوں کو حجاز سے نکال دو، اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دو''؛ یعنی اس سے پہلے کہ آگ بھڑک اٹھے، اس پر قابو پالو! اور عربوں کو ان فتنوں سے بچالو جو نہ کسی کو چھوڑیں گے اور نہ بخشیں گے! حجاز کے یہودیوں سے ہوشیار رہو، اور نجران والوں سے چوکنے رہو؛ ان پر فتنہ انگیزی کے راستے بند کر دو، اور

اس سے پہلے کہ وہ تمہیں دربدر کر دیں اور تمہارا خون بہائیں، تم انہیں باہر نکال دو، اے ایمان لانے والوں کی چھوٹی سی جماعت! اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیتا ہے، اس سے پہلے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے اس معاملے میں ایسی تفصیلی بات ارشاد فرماتے جس کے بعد وہ کبھی گمراہ نہ ہوتے۔ یوں یہ کلمہ بغیر کسی (واضح تاریخی) تفسیر کے باقی رہ گیا، یہاں تک کہ علماء نے اس کے مخفی راز کے بارے میں غیب کے تیر چلاتے ہوئے وہی کچھ کہا جو انہوں نے اپنے گمان کے مطابق کہا۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ پھر ابھی سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل بھی نہیں ہو پاتی کہ جزیرۃ العرب کے مخصوص علاقوں میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑتا ہے۔ چنانچہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا ایک ایسی بات ارشاد فرماتی ہیں جو ہم تک روایت تو کی گئی، مگر آج کے دن تک کسی نے اس پر (گہرائی سے) توجہ نہیں دی، آپ فرماتی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ حسرت آیات ہوئی تو میرے والد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر مصائب و آلام کا وہ پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ اگر وہ مضبوط اور اٹل پہاڑوں پر بھی گرتا تو انہیں بھی پاش پاش کر دیتا! مدینہ منورہ میں نفاق نے سر اٹھا لیا، عرب مرتد ہو گئے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خوف، بے

سر و سامانی اور تنہائی میں بارش میں بھیگی ہوئی ان بکریوں کی مانند ہو گئے جو سردی کی رات میں کسی باڑے[1] میں بند ہوں اور وہ جگہ درندوں سے بھری ہوئی ہو۔ پس اللہ کی قسم! صحابہ نے جس مسئلے میں بھی اختلاف کیا، میرے والد اس کے حل کے لیے کھڑے ہوئے اور اسلام کی طرف سے اس کا پورا دفاع کیا اور سرخرو ہوئے۔" اور ہمیں حضرت عروہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی اس صورتحال کی خبر دیتے ہوئے بتاتے ہیں: "اور عرب مرتد ہو چکے تھے؛ یا تو وہ مکمل طور پر پھر گئے تھے یا پھر ہر قبیلے کے کچھ خاص لوگ ارتداد کا شکار ہو چکے تھے۔ نفاق کھل کر سامنے آ چکا تھا، یہودی اور عیسائی نگاہیں اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کی تباہی کے منتظر تھے، اور مسلمان اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی، اپنی قلتِ تعداد اور دشمنوں کی کثرت کی وجہ سے سردیوں کی بارش والی رات میں بھیگی ہوئی بکریوں کی طرح بے بس دکھائی دے رہے تھے۔"

میرے اور آپ کے لیے یہ نہایت موزوں اور لائقِ ستائش ہے کہ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جائیں۔ ہم وہاں رکیں جہاں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم نے لا کھڑا کیا ہے کہ: "یہودیوں کو حجاز سے نکال

---

[1] حُش (اور حاء پر زبر کے ساتھ 'حَش' بھی): اس سے مراد باغ یا کھجوروں کا جھنڈ ہے (جہاں درخت ایک دوسرے سے گنجان اور ملے ہوئے ہوں)۔

دو، اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے جلا وطن کر دو۔'' ہم وہاں ٹھہریں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آخری کلمات نے ہمیں لا کھڑا کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانِ مبارک سے ادا فرمائے، اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد نے ہمیں لا کر کھڑا کر دیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نزع کی حالت اور موت کی بے چینی کے عالم میں فرمایا تھا کہ: ''اگر میں زندہ رہا تو جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہیں رہنے دوں گا۔'' اور جہاں ہمیں ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول نے لا کھڑا کیا ہے کہ:

''مدینہ میں نفاق نے سر اٹھا لیا اور عرب مرتد ہو گئے،''

اور جہاں ہمیں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو نے لا کھڑا کیا ہے کہ:

''عرب مرتد ہو گئے... نفاق کھل کر سامنے آ گیا، اور یہودی و عیسائی نگاہیں اٹھا اٹھا کر موقع کی تلاش میں لگ گئے۔''

پھر ہم سب مل کر قدیم مؤرخین کی کتابوں میں فتنۂ ارتداد کی جنگوں (حروبِ ردہ) کی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ انہوں نے اس کے اسباب کے بارے میں کیا لکھا ہے، اور جدید دور کے مصنفین اور مؤرخین کی کتابوں میں بھی اس کی تاریخ پڑھیں، اور مستشرقین (اورینٹلسٹس) کی کتابوں کا بھی مطالعہ کریں

جنہیں ڈاکٹر طٰہٰ حسین بہت بڑا مانتے ہیں اور ان کا کثرت سے نہایت احترام کے ساتھ ذکر کرتے ہیں؛ تو ہمیں وہاں کیا ملتا ہے؟

ہمیں وہاں ایک ایسا شدید ابہام اور گہرا اندھیرا ملتا ہے کہ گویا ہم کسی گہری وادی کے پیٹ میں اندھیری رات کو چل رہے ہوں، جس کے دائیں طرف بھی ایک بلند و بالا پہاڑ ہو اور بائیں طرف بھی ایک بلند و بالا پہاڑ، اور ان دونوں نے مل کر اس وادی کو ہر طرف سے ڈھانپ لیا ہو۔

جب ہم قدیم مؤرخین کی کتابوں میں فتنۂ ارتداد کو دیکھتے ہیں، تو وہ محض جمع کیے گئے ایسے اخبار و واقعات نظر آتے ہیں جو انہوں نے جیسے بن پڑا ایکجا کر دیے۔ کسی نے بھی نہ تو ان کے اسباب پر غور کیا، نہ ان محرکات پر نظر ڈالی جنہوں نے عربوں کو اس پر اکسایا تھا، نہ مرتدین کے احوال اور ان کی باہمی صفات و تعلقات کو پرکھا، اور نہ ہی ان کے مرتد ہونے سے پہلے ان کے درمیان پائے جانے والے مشترکہ پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اور جب ہم جدید دور کے مصنفین کی کتابوں میں ارتداد کی تاریخ دیکھتے ہیں، تو وہ بھی محض ایسی ہی خبریں معلوم ہوتی ہیں جنہیں ان کے لکھنے والوں نے بساط بھر ترتیب دینے کی کوشش تو کی ہے؛ مگر جب انہوں نے اس کے اسباب، اس کے محرکات، مرتدین کے اوصاف، ان کے باہمی تعلقات اور ارتداد سے پہلے ان کے مابین مشترکہ کڑیوں

کو تلاش کرنا چاہا — تو وہ اس بری طرح گڈ مڈ اور خلط ملط کر گئے گویا وہ کیچڑ کے سمندر میں کوئی موتی تلاش کر رہے ہوں۔ جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، تو انہوں نے حسبِ عادت اپنی کتابوں کو ایسے اوندھے اور تاریک جہل سے بھر رکھا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تردید کرتا نظر آتا ہے۔

جی ہاں، ہم ان تمام کتابوں میں فتنۂ ارتداد کی تاریخ پڑھتے ہیں، تو وہ سب کی سب یہودیوں اور منافقین کے ذکر سے خالی نظر آتی ہیں؛ سوائے چند بکھرے ہوئے کلمات کے جیسے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عروہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ارشادات، جو قدیم کتابوں میں سرسری طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اور جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے جو ان علمی و تاریخی ابحاث میں بلا صلاحیت گھسے چلے آرہے ہیں، وہ تو حروبِ ردۃ (ارتداد کی جنگوں) میں یہودیوں اور منافقین کا ذکر تک نہیں کرتے۔ ان کا یہ رویہ ان کے تعصب اور علمی بددیانتی کا ایک عجیب ترین مظہر ہے؛ کیونکہ وہ اسباب کی جستجو، ان کی گہرائی میں اترنے اور باریک سے باریک نکتہ کھود نکالنے کے اتنے حریص ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی واضح اور عیاں حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی — یعنی یہودیوں اور منافقین کی وہ حقیقت اور ان کی سازشوں کا وہ سنگین خطرہ جو ہجرتِ مدینہ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے وصالِ مبارک تک تاریخِ اسلام پر منڈلاتا رہا تھا! لیکن المیہ تو یہ ہے کہ آپ خود ہمارے اپنے مسلمان مصنفین کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اسی گمراہی کی دلدل میں جا گرے جہاں انہیں مستشرقین کے نام نہاد اساتذہ نے دھکیلا تھا، پس وہ غافل ہو گئے کہ فتنۂ اُرتداد کی اصل توجیہ کیا تھی؟ یہ کیسے شروع ہوا؟اس کی ابتدا کس نے کی؟ اور اس کا پورا معاملہ کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ سے یہ سوال نہیں کیا۔ کیا یہ ایسی حیرت کی بات نہیں جس کا تعجب کبھی ختم نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمانے سے لے کر اپنے وصالِ مبارک تک دس سال گزارے، اور ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کی سازشوں اور ان کے چیلوں چانٹوں اور پروردہ منافقین کے مکر و فریب کی وجہ سے شدید ترین آزمائشوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پورے دس سالوں میں یہودیوں سے بھی نبرد آزما رہے اور اوس و خزرج، دیگر قبائل اور مدینہ کے گرد و نواح کے اعراب (بدوؤں) میں پھیلے ان کے سازشی جالوں کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔ مزید برآں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دس سالوں میں اپنے رب کی طرف سے وحی وصول فرماتے رہے؛ چنانچہ مدینہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت یعنی سورۂ

بقرہ کا اکثر حصہ یہودیوں اور منافقین کے تذکرے، ان کے احوال کی وضاحت، ان کے باہمی گٹھ جوڑ، اور ان مؤمنین کے خلاف ان کی مشترکہ سازشوں کے بیان پر مشتمل ہے جنہوں نے اس دین کی پیروی کی جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا تھا۔اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری سورتوں میں سے ایک یعنی سورۂ برأت (توبہ) کو دیکھتے ہیں، تو وہ پوری کی پوری یہودیوں اور منافقین کے اوصاف، ان کی گفتگو، ان کی ریشہ دوانیوں، ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو بے نقاب کرنے کے بارے میں ہے؛ یہاں تک کہ اس سورت نے انہیں رسوا کر کے رکھ دیا اور ان کے دلوں میں چھپے مکر، بغض، کینے اور نفاق کی ایسی خبر دی کہ وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ پھر موت کی اسی سخت بے چینی کے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلنے والا آخری کلام یہ ہوتا ہے: ''اگر میں زندہ رہا تو جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہیں رہنے دوں گا،'' اور اپنے صحابہ کو آپ کا یہ حکم دینا کہ: ''یہودیوں کو حجاز سے نکال دو، اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے جلا وطن کر دو۔'' پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیتا ہے اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی جاتی ہے، ابھی چند ہی دن گزرتے ہیں کہ جزیرۃ العرب کے مخصوص علاقوں میں شمال و

جنوب اور مشرق و مغرب ہر طرف ارتداد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے — تو کیا یہ ایسی حیرت کی بات نہیں جس کا تعجب کبھی ختم نہیں ہو سکتا کہ اس سب کے باوجود، ہمیں قدیم یا جدید مؤرخین کی کتابوں میں — اور اگر آپ چاہیں تو مستشرقین کی کتابوں میں بھی — فتنۂ ارتداد کے معاملے میں یہودیوں اور منافقین کا کوئی ذکر تک نہیں ملتا؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی عربوں کی تاریخ سے یہودیوں اور منافقین کا ذکر اچانک یوں ہی ختم ہو جاتا ہے؟ کیا عقلیں اس بات کو تسلیم کر سکتی ہیں کہ یہودی اور ان کے پروردہ منافقین پورے دس سال تک مسلسل، دن رات، اسلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمن مردوں اور عورتوں کے خلاف سازشیں کرتے رہیں، اور جیسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے (سنہ 11 ہجری میں)، تو انہوں نے ہر سازش سے اپنے ہاتھ کھینچ لیے؟ اور اس کے بعد تاریخِ اسلام میں پیش آنے والے ہر واقعے سے بالکل بری الذمہ ہو گئے — وہ سنہ 11 ہجری کے فتنۂ ارتداد سے بھی بری ہو گئے، سنہ 23 ہجری میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی بری ہو گئے، اور سنہ 35 ہجری میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے المیے سے بھی پاک صاف ہو گئے؟

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر آپ کے اس فرمان کا اصل مفہوم کیسے پوشیدہ رہ گیا کہ : ''یہودیوں کو حجاز سے نکال دو، اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دو''؟ اور ہمارے متقدمین علماء اس حدیث کے حقیقی معنی اور اس کے پسِ منظر سے کیسے غافل رہے؟ اور قدیم مؤرخین فتنۂ ارتداد کی تاریخ اور یہودیوں و منافقین کی تاریخ کے باہمی ربط کو سمجھنے سے کیسے قاصر رہے؟ اور آخر کار، اسلام میں یہ ارتداد کیسے رونما ہوا؟ اور اس کے بعد اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

یہ وہ داستان ہے جو میں آپ کو سناؤں گا، اگر اللہ نے میری عمر میں مہلت دی، یہاں تک کہ انہی صفحات پر اپنے اسی مقام پر میری آپ سے دوبارہ ملاقات ہو۔

[الفتنۃ الکبریٰ]

میں نے اس شمارے میں شائع ہونے والی اس تحریر کا مطالعہ کیا جو ''الفتنۃ الکبریٰ'' کے بارے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب پر لکھے گئے میرے ایک مضمون پر تبصرے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ پس جب میں نے اسے پڑھا، تو میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ ''الرسالہ'' کے قارئین کا وقت ڈاکٹر شوقی ضیف کے کلام پر تنقید و تبصرے میں صفحات ضائع کر کے برباد نہ کروں، چنانچہ میں نے جلدی سے یہ تحریر لکھ ڈالی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں خود ڈاکٹر شوقی ضیف کو مخاطب کروں اور ان باتوں کا جواب دوں جو انہوں نے مجھ پر کیے گئے اپنے ردِ عمل میں لکھی ہیں۔

پس سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر شوقی نے اپنی گفتگو کو طویل کر دیا ہے، جس کا بیشتر حصہ خود ڈاکٹر طٰہٰ کی کتاب ہی میں موجود ہے۔ گویا انہوں نے اس کی شرح کرنے کا ارادہ کیا تھا، حالانکہ وہ خود بھی اور ہم بھی اس قسم کی شرح سے بالکل بے نیاز تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے ان اسباب پر بھی بہت لمبی چوڑی بحث کی ہے جن کی بنا پر عبداللہ بن سبا کے قصے کی نفی کی جاتی ہے؛ حالانکہ ہم نے یہ

کب کہا تھا کہ ہم اس قصے کو محض امام طبری کی روایت سے ثابت کر رہے ہیں! بلکہ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے جن دلائل کی بنیاد پر اس قصے کو جھٹلایا ہے وہ کمزور اور ناقابلِ قبول ہیں، اور یہ اسباب میرے مضمون میں تفصیل سے درج ہیں مگر ڈاکٹر شوقی ان کی کمزوری اور بے وزنی کو بھانپ نہ سکے۔ رہی بات ہمارے اس قصے کو ثابت کرنے کی، تو وہ آگے چل کر ایک ایسے الگ اور منفرد راستے سے سامنے آئے گی جس کا ڈاکٹر ضیف گمان بھی نہیں کر سکتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ انہوں نے یاقوت حموی کے حوالے سے امام طبری کی تفسیر اور ان کی تاریخ کے متعلق ایک بات ذکر کی ہے، اور وہ یہ کہ طبری نے اپنی تاریخ میں ایسے راویوں سے روایات نقل کی ہیں جو ثقہ نہیں ہیں، جب کہ اپنی تفسیر میں ان کی متہم (مشکوک) حیثیت کے پیشِ نظر ان سے اس قسم کی روایات نقل نہیں کیں۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ طبری کا ایسے لوگوں کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر تھا کہ وہ ثقہ نہیں ہیں، چنانچہ انہوں نے تفسیر کو ان کے ذکر سے پاک رکھا کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے جس میں شدید احتیاط واجب ہے؛ رہی تاریخ، تو اس میں اس درجے کی احتیاط کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ حالانکہ محدثین اور مفسرین کے ہاں راویوں کو رد کرنے

اور ان پر جرح کرنے کے جو پیمانے ہیں، انہیں مؤرخین، ادباءاور عام راویوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو ہمیں پوری تاریخ، پورے ادب اور پوری لغت کی روایات کو مسترد کرنا پڑے گا، اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ضیف نے اس معاملے پر غور و فکر کا حق ادا نہیں کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ فرض بھی نہیں ہے کہ میں ان فنون کے اصول و قواعد ہر اس شخص کو سمجھاتا پھروں جو ان سے واقف نہیں ہے یا ان کی کماحقہ معرفت نہیں رکھتا، الا یہ کہ کوئی شخص محض کسی کی طرف داری اور ہٹ دھرمی کے جذبے سے بالاتر ہو کر خالص علمی سوال کرے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کے ذکر میں جلد بازی سے کام لیا ہے جن پر تنقید کرنے سے ہم انہیں معاف ہی رکھتے ہیں، کیونکہ یہ باتیں بہت طویل ہیں اور ان کی وضاحت بھی طویل وقت چاہتی ہے۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ ان باتوں کو اسی طرح جانتے ہیں جیسے میں جانتا ہوں، اور وہ ان میں چھپے ہوئے اعتراض اور عیب کے پہلو کو اچھی طرح بھانپ گئے ہوں گے۔

اور معاملہ کچھ بھی ہو، میں نے ''الفتنۃالکبریٰ'' کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اسے ابھی مکمل نہیں کیا ہے، اور شاید اگر معزز استاد ڈاکٹر شوقی ضیف

تھوڑا سا صبر کر لیتے تو وہ ایسی چیز دیکھ لیتے جو انہیں مطمئن کر دیتی یا قائل کر دیتی۔ رہی جلد بازی، تو وہ انسان کے ہاتھ کچھ نہیں لاتی سوائے اس کے کہ غلطی پر غلطی سوار ہوتی چلی جائے، اور ہم تو لکھتے ہی اس لیے ہیں تا کہ غلطیوں کا ازالہ کریں، نہ یہ کہ انہیں ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کرتے جائیں۔

معزز استاد مجھے معاف فرمائیں اگر وہ یہ محسوس کریں کہ میں نے تاریخ، حدیث اور تفسیر میں روایت کے مسئلے پر، نیز یہ کہ یہ روایتیں کیسے مروی ہوتی ہیں، ان کی شرائط کیا ہیں، اور ایک محقق کو کب ان چیزوں پر گہری نظر رکھنی چاہیے اور کب ان سے چشم پوشی کر لینی چاہیے، انہیں کوئی تشفی بخش وضاحت فراہم نہیں کی ہے؛ پس اگر وہ اس معاملے کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ جاننا چاہتے ہیں، تو وہ خود ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہی سے دریافت کر لیں، کیونکہ وہ ان شاءاللہ ایسے مآخذ و مراجع کی طرف ان کی رہنمائی فرما دیں گے جو اس مسئلے کو واضح کرنے میں ان کے مددگار ثابت ہوں۔۔۔

ترجمہ: ابو مصعب اثری

❀ ❀ ❀ ❀